بیدی کے افسانے

راجندر سنگھ بیدی

بیدی کے افسانے

راجندر سنگھ بیدی کی دیگر کُتب

۱- ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

۲- بیجان چیزیں

بیدی کے افسانے

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ اُردو ادب
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— پریس لاہور
قیمت ——— ۱۰/- روپے

ترتیب

راجندر سنگھ بیدی	کنہیا لال کپور	۷
افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل	راجندر سنگھ بیدی	۲۱
چند لمحے بیدی کی نئی کہانی کے ساتھ	گوپی چند نارنگ	۳۳
ایک باپ بکاؤ ہے		۴۴
بولو		۶۴
حجام الہ آباد کے		۹۲
جیون پرست		۱۲۶
شکار		۱۳۸

راجندر سنگھ بیدی

راجندر سنگھ بیدی کا نام زبان پر آتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ نام نہیں نغمہ ہے۔ بیدی واقعی خوش نصیب ادیب ہے کہ وہ ایک خوبصورت رفیقۂ حیات کے علاوہ ایک خوبصورت نام کا بھی مالک ہے۔ میں نے پہلی بار یہ نام "ادبی دنیا" کے سالنامے میں پڑھا اور مجھے اس نام پر بے اختیار پیار اور رشک آیا جس شخص کا نام راجندر سنگھ بیدی ہو، میں نے سوچا اُسے واقعی بہت بڑا ادیب ہونا چاہیئے۔ اس نام میں شعریت اور موسیقیت ہے۔ یہ نام نہیں۔ چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی غزل کا مصرع ہے!

سنہ ۱۹۳۹ء کی سرما کی ایک شام کو میں کرشن چندر کے مکان (واقع موہنی روڈ لاہور) پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک دو نوجوان کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں نکّے اور

قمیص پہنے ہوئے تھے اور راوی پر بوٹنگ کر کے آ رہے تھے۔ کرشن چندر نے دونوں کا بڑے خلوص سے استقبال کیا۔ ان میں سے ایک گندمی رنگ اور درمیانے قد کا سکھ نوجوان تھا جو ضرورت سے زیادہ ستم زدہ نظر آتا تھا کرشن چندر نے میرا اس سے رسمی تعارف کراتے ہوئے کہا:

"آپ مشہور افسانہ نویس راجندر سنگھ بیدی ہیں۔"

ایک لحظہ کے لئے مجھے محسوس ہوا کہ کرشن چندر میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ بھلا یہ معمولی سا۔ یونہی سا۔ بے چارہ سا شخص راجندر سنگھ بیدی کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے اس کے خد و خال کا جائزہ لیا۔ ایک عام سا چہرہ۔ خوشنما سی چھوٹی سی ڈاڑھی اور عجیب سی آنکھیں۔ ایسی آنکھیں جنہیں نہ اچھا کہا جا سکتا ہے نہ برا۔ جن میں ذہانت کے بجائے مظلومیت اور بے چارگی کی جھلک ہے۔ جیسے وہ آنکھیں بڑے مدھم اور دھیمے انداز میں کہہ رہی ہوں

"تم دیکھ رہے ہو۔ راجندر سنگھ بیدی انسان نہیں، فرشتہ ہے لیکن افسوس اس دُنیا میں فرشتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔"

دس پندرہ منٹ بیٹھنے کے بعد راجندر سنگھ بیدی اور اُس کا ساتھی (جو دھرم پرکاش آنند تھا) رخصت ہوئے۔ کرشن چندر نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا:

"کاش اتنا اچھا افسانہ نویس ڈاک خانے میں اپنا وقت برباد نہ کرتا۔"

ڈاک خانے میں، یا الہیٰ یہ کرشن چندر کیا کہہ رہا ہے۔ بیدی ایسا افسانہ نویس اور ڈاک خانے میں۔

"ڈاک خانے میں وہ کیا کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معمولی ملازم ہے"، کرشن چندر نے ایسی آواز میں جواب دیا جس پر ماتم کا گمان ہوتا تھا۔

یہ میری راجندر سنگھ بیدی سے پہلی ملاقات تھی۔

اُسی سال کرسمس کے دنوں میں مجھے ایک دفعہ جنرل پوسٹ آفس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کھڑکی کے پیچھے راجندر سنگھ بیدی بیٹھا ہوا بجلی کی سی تیزی سے خطوط اور لفافوں پر مہریں لگا رہا ہے۔ ایک لفافہ۔ دوسرا لفافہ۔ تیسرا لفافہ۔ چوتھا لفافہ..... لفافوں کا سلسلہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ کبھی کبھار وہ دائیں طرف لگی ہوئی گھڑی پر اچٹتی نظر ڈال لیتا ہے اور پھر اُسی برق رفتاری سے مہریں لگانے لگتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ ایک آدھ بار سوچا کہ اُس کے قریب جاؤں لیکن ہمت نہ ہوئی..... راجندر سنگھ بیدی ایک کافی لمبے عرصے تک ڈاک خانے میں مہریں لگاتا رہا اور ساتھ ساتھ اُردو افسانہ پر اپنی عظمت کی مُہریں ثبت کرتا رہا۔ اور اُس کے علاوہ اُس کے بیشتر احباب کفِ افسوس ملتے رہے کہ قدرت نے اُس کے ساتھ کتنا خوف ناک مذاق کیا ہے۔

۱۹۴۷ء میں جون کی ایک شام کو مہندرناتھ میرے گھر آیا اور بڑے اُداس لہجے میں کہنے لگا:

"جب سے بیدی کا تبادلہ لاہور ریڈیو اسٹیشن ہوا ہے۔ اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ چلو آج بیدی کے پاس چلتے ہیں۔"

مہندرناتھ کی بیدی سے اس ناگہانی عقیدت کا راز میری سمجھ میں نہ آیا کیونکہ اکثر میں اور مہندر۔ کرشن چندر کو چڑانے کے لئے بیدی کی بُرائی کیا کرتے تھے کرشن چندر پلنگ پر لیٹے ہوئے ہوتے۔ مہندر اور میں فرش پر۔ ہم دونوں میں سے کوئی بیدی کو زیر بحث لے آتا۔

مہندر: یار یہ بیدی بالکل فراڈ (FRAUD) ہے پنجاب کا سب سے بڑا فراڈ۔ خدا جانے لوگ اسے افسانہ نویس کیوں سمجھتے ہیں۔

میں: لوگ تو بالکل جاہل ہیں۔ مہندر۔ اور پھر اتنے جاہل بھی نہیں۔ دراصل وہ بیدی کو بناتے ہیں کہ بے بھی تو بھی افسانہ نویس ہے۔

کرشن چندر: شیطان! کیا بک رہا ہے۔ بیدی کی عظمت میں شک کرنا کفر ہے۔

میں: اور بیدی پر ایمان لانا ذہنی دیوالیہ پن ہے۔

مہندر: کتنا اُلجھا ہوا اسلوبِ بیان ہے بیدی کا۔

میں: بالکل۔ جیسے جلیبی۔

مہندر: ہاں ہاں جلیبی۔

میں: جیسے کیسوں (بالوں) میں کنگھی کرتے وقت کنگھی اُلجھ کر رہ جائے۔
کرشن چندر: بکواس مت کرو۔ جس چیز کا علم نہ ہو۔ اُس کے متعلق فتوے مت دیا کرو۔
مہندر: کرشن جی۔ آپ تو خواہ مخواہ بیدی کی طرفداری کر رہے ہیں میں کہتا ہوں۔ جیسے افسانے بیدی لکھتا ہے۔ اُس سے بہتر میں افسانے لکھ سکتا ہوں۔
کرشن چندر: لکھ سکتے ہو۔ تو لکھتے کیوں نہیں۔ بیدی نے تمہیں منع کیا ہے کیا؟

مہندر ناتھ نے اُس وقت تک لکھنا شروع نہیں کیا تھا اور حقیقت ہے۔ کہ بیدی سے بہتر افسانے لکھنے کے رقیبانہ جذبہ نے مہندر ناتھ کو افسانہ نویس بنا دیا۔ اور جب مہندر ناتھ نے شروع شروع میں افسانے لکھے۔ تو اُسے بیدی پر ایمان لانا ہی پڑا۔

چنانچہ میں اور مہندر نے فیصلہ کیا۔ کہ آج بیدی کے ہاں ایک دلچسپ شام گزاری جائے۔ چھ بجے کے قریب ہم لاہور چھاؤنی میں بیدی کے مکان پر پہنچے۔ پتہ چلا کہ بیدی صاحب ابھی ڈاک خانے سے واپس نہیں آئے۔ ڈاک خانے گئے۔ بیدی نے نہایت لجاجت سے کہا۔ آج کام کچھ زیادہ ہے۔ ساڑھے چھ بجے سے پہلے فارغ نہ ہو سکوں گا ہم دونوں

اُس کے گھر پر انتظار کرتے رہے۔ پونے سات بجے بیدی ڈاک خانے سے لوٹا۔ ہم اُسے لعن طعن کرنے لگے۔ ڈاک خانے کی ملازمت میں کیا رکھا ہے۔ اِسے ترک کیوں نہیں کرتے۔ کب تک یہ عجیب مذاق برداشت کرتے رہو گے۔ بیدی بھیگی بلی بنا ہماری ڈانٹ ڈپٹ سُنتا رہا۔ کبھی کبھی ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہہ دیتا:

"ملازمت چھوڑ دوں تو کیا کروں۔ بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ دو تین بچے ہیں۔ ایک بھائی کالج میں پڑھتا ہے۔ میری انگریزی کی تعلیم معمولی ہے۔ کوئی دوسری ملازمت ملے گی نہیں۔"

ہم نے اُسے کئی مشورے دیتے۔ لیکن وہ ہر بار یہی کہتا رہا۔ ملازمت چھوڑ دوں تو بھوکا مروں گا۔ اگر گریجویٹ یا ایم۔ اے ہوتا۔ تو دوسری بات تھی۔

دراصل بیدی اُن دنوں احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ خود اعتمادی اُس میں نام کو نہ تھی۔ اکثر وہ اپنے احساسِ کمتری کا اظہار آنکھیں جھپکا کر یا شانے ہلا کر کیا کرتا تھا۔ ہم میں سے اکثر اُس کی اس کمزوری سے واقف تھے اور کبھی کبھی اُس کو شرارتاً بنایا بھی کرتے تھے۔

"بیدی صاحب۔ اگر آپ نے انگریزی کی تعلیم حاصل کی ہوتی تو آپ کا شمار صفِ اوّل کے افسانہ نویسوں میں ہوتا۔"

"ہاں یار۔ یہ تو کافی حد تک صحیح ہے۔ دراصل حالات ہی ایسے تھے۔

کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔"

"بیدی صاحب۔ آپ کے افسانوں میں ایک چیز بڑی طرح کھٹکتی ہے۔ اور وہ ہے رومانیت کا فقدان۔"

"یار۔ میری زندگی بھی تو ایسی ہے۔ رومانیت کہاں سے آجاتی۔"

"بیدی صاحب۔ اگر آپ معمولی سوٹ کی بجائے بڑھیا سوٹ پہنتے تو کتنے اچھے لگتے۔"

"یار۔ ساٹھ روپے میں بڑھیا سوٹ کس طرح پہن سکتا ہوں۔"

"بیدی صاحب۔ اگر آپ کے اسلوب بیان میں انفرادیت ہوتی تو کیا بات تھی۔"

"یار مجھے خود اس کمزوری کا احساس ہے لیکن کیا کروں۔"

اس ضمن میں مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آگیا۔ ایک دفعہ بیدی سے میری ملاقات سرِ راہ ہو گئی۔ اُس وقت بیدی، ادبِ لطیف، کا اعزازی مدیر تھا۔ وہ مجھے ادب لطیف کے دفتر لے گیا اور اپنی کتاب "دانہ و دام" اُٹھا کر کہنے لگا۔ میں آپ کو اپنے دو افسانے پڑھ کر سُنانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آپ سے ایک سوال کروں گا۔ دونوں افسانے پڑھنے کے بعد اُس نے پوچھا "بتلائیے ان دونوں میں سے کونسا افسانہ پسند آیا؟"

"دونوں،،

"اچھا۔ پہلے افسانے کا اسلوب بہتر ہے۔ یا دوسرے کا۔"

میں اُس وقت بیدی کو بنانے کے موڈ میں تھا۔ اس لئے میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ بیدی صاحب۔ اسلوب کا مسئلہ ذرا پیچیدہ ہے۔ دراصل جب تک آپ اسلوب پر جرمن مصنف وان گان زان۔ زٹ وٹ برگ کی کتاب نہ پڑھیں۔ آپ اسلوب کی پیچیدگیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میرے پاس یہ کتاب ہے۔ وہ میں آپ کو پڑھنے کے لئے دوں گا۔

بیدی سچ مچ میری باتوں میں آگیا۔ اُس کے بعد کئی دفعہ اُس نے مجھ سے وان گان زان زٹ وٹ برگ کی کتاب لانے کے لئے کہا اور میں ہر بار کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے اُسے ٹالتا رہا۔

اور پھر ایک دن بیدی نے کرشن چندر کے کہنے پر ڈاک خانے کی ملازمت ترک کر دی۔ اُس کے سب دوستوں کو تعجب ہوا کہ بیدی جیسے کم ہمت شخص نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔ پھر پتہ چلا۔ کہ بیدی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گیا۔ ریڈیو میں جانے کے بعد بیدی کی گوناگوں ایڈوینچرز (ADVENTURES) کا دور شروع ہوا۔ وہ لاہور سے دہلی پہنچا۔ جہاں وہ پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ میں ایک معزز عہدے پر تعینات ہوا۔ جنگ کے ختم ہونے کے بعد اُس نے دھیشوری فلمز لاہور، میں ملازمت کر لی اور فلم "کہاں گئے" کے مکالمے لکھے۔ فلم لائن سے دل برداشتہ ہو کر اس نے سنگم پبلشرز نسبت روڈ

کی بنیاد رکھی۔ اُن دنوں بیدؔی ایک ملازمت ترک کر کے دوسری اس طرح تیار کر لیتا تھا جیسے کوئی شخص ایک انگوٹھی اُتار کر دوسری پہن لے۔ آج ریڈیو میں ہے۔ کل فلم انڈسٹری میں، اور پرسوں ناشر بنا بیٹھا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد بیدؔی لاپتہ ہوگیا اور پھر یک لخت ریڈیو کشمیر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ چند ماہ کے بعد اُس نے ریڈیو کی ملازمت ترک کر دی اور بمبئی چلا گیا۔ جہاں وہ اُس وقت سے اب تک ایک کامیاب افسانہ نویس اور مکالمہ نویس کے فرائض انجام دے رہا ہے۔

میں بیدؔی کی شخصیت کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا تھا، لیکن میں نے بیدی کی زندگی کے اہم واقعات قلمبند کر دیئے۔ دراصل بیدی کی زندگی کا اُس کی شخصیت سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو بیدؔی کی دو زندگیاں اور دو شخصیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق اُس بیدؔی سے ہے جو ڈاک خانے میں ملازم ہوا کرتا تھا اور دوسری وہ جو اُس وقت معرضِ وجود میں آئی۔ جب بیدؔی نے ہُچرا کارے کند عاقل" کے مقولے پر عمل کرتے ہوتے ڈاک خانے کی ملازمت ترک کر دی۔

اس دوسری شخصیت کی نشو ونما زیادہ تر دہلی میں ہوئی چنانچہ جنگ کے ختم ہونے کے بعد جب بیدؔی دہلی سے لاہور آیا تو ماضی اور حال کے بیدؔی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اب وہ بڑے بڑوں کے کان کاٹتا تھا۔

دلچسپ چوٹیں کرتا تھا۔ چُست فقرے کستا تھا اور اُس کے دوست اُس کی باتیں سُن کر دل ہی دل میں حیران ہوتے تھے کہ

بات تک کرنی نہ آتی تھی انہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

بھیگی بلّی اب مرکھنی گائے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ احساسِ کمتری کی جگہ خود اعتمادی نے لے لی تھی۔ اب بیدی سے بات کرتے ڈر لگتا تھا کہ اگر ذرا کہیں لغزش ہوئی تو بیدی کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اپنی گفتگو میں وہ موپاساں۔ چیخوف۔ مائیکل شولوخوف۔ ایلیا اہرن برگ کا ذکر اس انداز میں کرتا تھا۔ جیسے یہ سب اُس کے بڑے اچھے ذاتی احباب ہوں!

اُن دنوں اُس کا محبوب شغل اُن سب دوستوں سے انتقام لینا تھا۔ جو اُسے کبھی سنرانٹا بنایا کرتے تھے۔

کسی نے کنہیا لال کپور کا ذکر کیا۔ بیدی نے جھٹ پھبتی کسی "کپور کے متعلق ہی کسی نے کہا ہے۔ کپور سے کپور تیری کون سی کل سیدھی۔"

کسی نے ایک مشہور ادیب کی بات چھیڑی۔ بیدی نے برجستہ کہا۔ ہاں اُس بے چارے نے ہاتھ پاؤں تو بہت مارے۔ لیکن ابھی تک بات بنی نہیں۔

کسی اور نے کہا،

"فلاں شخص نے بڑا اچھا افسانہ لکھا ہے،" بیدی نے تبصرہ کیا۔

„ اُس کا افسانہ واقعی اچھا کہلاتا۔ اگر اُس سے پیشتر وہی افسانہ موپاساں نے نہ لکھا ہوتا۔“

بیدی کی غیر معمولی ذہانت کے جوہر اُسی زمانے میں کھلے۔ انھی دنوں کی بات ہے کہ ایک بار اُس نے مجھ پر چوٹ کرتے ہوئے پوچھا "کپور صاحب کارٹون اور کیری کیچر (CARICATURE) میں کیا فرق ہے۔ مثال دے کر واضح کیجیے۔"

میں نے مذاقاً کہا "بیدی صاحب، میں قدرت کا سب سے بڑا کارٹون ہوں اور آپ آج سے چند سال پہلے قدرت کے سب سے بڑے کیری کیچر تھے۔"

ہنس کر کہنے لگا "پہلی بات تو بالکل صحیح ہے لیکن دوسری محلِ نظر ہے۔"

ایک بار اُس نے میرے ہاتھ میں "فرہنگِ عامرہ" کا نسخہ دیکھ کر کہا "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے مطالعہ کے بعد آپ صحیح اردو لکھنے لگیں گے۔ تو ایں خیال است و محال است و جنوں۔ کیونکہ آپ کی اُردو صحیح اردو تو کجا صحیح پنجابی بھی نہیں ہوتی!"

سب سے دلچسپ چوٹ اُس نے ایک دفعہ ایک پرائیویٹ محفل میں کی کسی نے پطرس کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"کاش وہ "پطرس کے مضامین" کے بعد لکھنا ترک نہ کر دیتے" بیدی نے نہایت معصوم بن کر کہا "میں پطرس کی دیانتداری کا معترف ہوں" اُس

نے محسوس کیا۔ کہ وہ پطرس کے مضامین، ایسی یا اُس سے بہتر کتاب نہیں لکھ سکے گا۔ چنانچہ اُس نے لکھنا ترک کر دیا۔ کنہیالال کپور کی طرح نہیں کہ ڈھیٹ بن کر لکھے چلا جاتا ہے۔ حالانکہ تمام سمجھدار لوگ اُس سے عاجز آ چکے ہیں۔"

فطرتاً بیدی بڑا حساس واقع ہوا ہے۔ اُسے ہر ستم زدہ سے آنِ واحد میں ہمدردی یا محبت ہو جاتی ہے۔ وہ شخص دیویندر ستیارتھی ہو (زمانہ ماضی کا دیویندر ستیارتھی) راما نند ساگر ہو (سن بیالیس کا راما نند ساگر) بلونت سنگھ ہو یا بلونت کارگی (پنجابی ڈراماسٹ) ہو۔ بیدی اُس کے آنسو پونچھنے کے لئے اس فراخدلی سے تیار ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ اُس فرض کو انجام دینے کے لئے مدت سے چشم براہ تھا۔ وہ اپنا بیش قیمت وقت اُن کی دلجوئی اور خاطرداری بلکہ صرف کر کے ایک عجیب روحانی مسرت محسوس کرتا ہے "ڈوبتے ہوؤں کو تھام لینا" اُس کے کردار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مہمان نوازی میں اُس کا مقابلہ کوئی عربی یا عجمی کر سکتا ہے۔ معمولی سے معمولی واقف کار اُس سے ملنے آتے۔ تو یہ کیفیت ہوتی ہے جیسے بیدی محسوس کر رہا ہو کہ ع

بن گیا گھر مرا خیام کا گھر آج کی رات

لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے بیدی کو والہانہ اُنس ہے۔ خاص کر جب وہ اپندرناتھ اشک سے ملتا ہے۔ تو سب سے پہلی فرمائش یہ کرتا ہے۔ "کوئی نیا چٹکلہ سناؤ" اشک کی عادت ہے کہ چٹکلہ سنانے کے فوراً بعد ایک

فلک شگاف قہقہہ بلند کرے گا اور بیدی چُٹکلے پر ہنسنے کی بجائے اشک بہانا شروع کر دے گا۔

بیدی کی شروع سے خواہش رہی ہے کہ اُس کا نام ایک ہی سانس میں کرشن چندر کے ساتھ لیا جائے۔ شروع شروع میں جب نقادوں نے کرشن چندر کے نام کو بہت اچھالا۔ اور بیدی کی طرف مقابلتہً کم توجہ دی تو اُسے نقادوں کی دیانت پر شک ہونے لگا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب ہر کہ دمہ نے بیدی کا لوہا مان لیا۔ تو اُسے اطمینان ہوا۔ کرشن چندر غالباً بیدی کے سب سے پہلے اور سب سے بڑے مداح ہیں مجھے یاد ہے کہ نئے زاویئے کی جلد نمبر ۲ میں انہوں نے بیدی کا افسانہ "گرہن" سرِ فہرست رکھا تھا۔ اُس وقت بعض لوگوں نے جو بیدی سے جلتے تھے۔ اعتراض کیا کہ بیدی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ کرشن چندر نے ان لوگوں سے کہا تھا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اگر نئے زاویئے میں اس افسانے کے سوا اور کچھ بھی نہ ہوتا۔ تب بھی یہ ایک نمائندہ اور جاندار مجموعہ ہوتا۔"

بیدی اُس وقت ترقی پسند تھا۔ جب لوگ ترقی پسندی کا مفہوم بھی اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے۔ وہ خود نچلے طبقہ میں پیدا ہوا اور اُسے اس طبقہ سے محض ہمدردی نہیں۔ بلکہ عشق ہے۔ اُس نے ہمیشہ اس طبقہ کی نمائندگی کی ہے اور اس کامیابی سے کی ہے کہ آنے والے دَور میں اگر بیدی

کو ہندوستان کا گورکی سمجھ لیا جائے۔ تو بہت کم لوگوں کو تعجب ہوگا۔
چھٹ پنے میں بیدی نے حالی کا مشہور شعر سُنا تھا ؎

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اُسی وقت سے اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر ا انسان ہونے کی کوشش کرے گا۔ آج جب کہ وہ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکا ہے، وُہ فخر سے کہہ سکتا ہے "انسان بننے کے لئے جو محنت کرنی پڑتی ہے، اُس سے میں نے کبھی گریز نہیں کیا۔ چاہے میں مکمل انسان ہوں یا نہیں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جتنی انسانیت مجھ میں ہے۔ اُس سے زیادہ بہت کم ادبا میں ہوگی"!

کنہیا لال کپور

افسانوی تجربہ اور اظہار کے تخلیقی مسائل

میں معافی چاہوں گا۔ کہ اس مضمون کو کھولنے کے لئے مجھے اپنی ذات میں سے ہو کر گزرنا پڑ رہا ہے۔ آپ اس لئے بھی در گزر کریں گے کہ اتنی بڑی مخلوق کی میں بھی اکائی ہوں ایک، اس لئے سب کو سمجھنے کے لئے میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ پہلے میں اپنے آپ سے سمجھ لوں۔

افسانوی تجربہ کیا ہے؟ مجھے افسانہ سازی کی لت کیسے پڑی؟ اگر یہ مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو پڑی، تو باقی دوسروں کو کیوں نہیں پڑی، کیوں نہیں میں کسی فرنانڈس کی طرح گمہ جے کے سامنے بیٹھا موم بتیاں بیچتا؟

فن کسی شخص میں سونے کی طرح سے نہیں پھوٹ نکلتا۔ ایسا نہیں، کہ آج رات آپ سوئیں گے اور صبح فن کار ہو کر جاگیں گے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں

آدمی پیدائشی طور پر فن کار ہے، لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے، البتہ کہ اس میں صلاحیتیں ہیں، جن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چاہے وہ اسے جبلت میں ملیں اور یا وہ ریاضت سے ان کا اکتساب کرے۔ پہلی تو یہ کہ وہ ہر بات کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہو، جس کے لئے ایک طرف تو وہ دادو تحسین پاتے اور دوسری طرف ایسے دُکھ اُٹھاتے۔ جیسے کہ اُس کے بدن پر سے کھال کھینچ لی گئی ہو اور اسے نمک کی کان سے گزرنا پڑ رہا ہو۔ دوسری صلاحیت یہ کہ اس کے کام و دہن اُس چرند کی طرح سے ہوں جو منہ چلاتے میں خوراک کو ریت اور مٹی سے الگ کر سکے۔ پھر یہ خیال اس کے دل کے کسی کونے میں نہ آتے کہ گھاسلیٹ یا بجلی کا زیادہ خرچ ہو گیا یا کاغذ کے ریم کے ریم ضائع ہو گئے۔ وہ جانتا ہو کہ قدرت کے کسی بنیادی قانون کے تحت کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ پھر وہ ڈھیٹ ایسا ہو کہ نقش ثانی کو ہمیشہ نقش اول پہ فوق دے سکے۔ پھر اپنے فن سے پرے کی باتوں پہ کان دے۔ مثلاً موسیقی، اور جان پائے کہ استاد آج کیوں سُر کی تلاش میں بہت ہی دور نکل گیا ہے مصوری کے لئے نگاہ رکھے اور سمجھے کہ وحشی واسنتی میں خطوط کیسی رعنائی اور توانائی سے اُبھرے ہیں۔ اگر یہ ساری صلاحیتیں اس میں ہوں تو آخر میں ایک معمولی سی بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جس ایڈیٹر نے اس کا افسانہ لوٹا دیا ہے، اُسے گدھا ہے!

اس کے بعد کوئی بھی چیز افسانے کے عمل کو چھیڑ (TRIGGEROFF)
کر سکتی ہے۔ مثلاً کوئی راہ جاتا اس کی پگڑی اچھال دے یا کوئی ایسا حادثہ
پیش آجائے، جس پہ اس غریب کا کوئی بس نہ ہو اور جو اسے بے سلامتی کا شکار
کر دے اور وہ اپنے آپ میں ٹھان لے کہ مجھے اس بے تعاون اور بے رحم دنیا
میں کہیں جگہ پانا ہے، کچھ بن کے دکھانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک
آدمی خطرے سے دوچار نہیں ہوتا اس میں مدافعت کی وہ قوتیں نہیں اُبھرتیں
قدرت نے پاس جن کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔

نوعمری میں یہ سب باتیں میرے ساتھ ہوئیں اور مجھے یقین ہے کہ تھوڑے
یا زیادہ فرق کے ساتھ دوسرے فن کاروں پر بھی بیتی ہوں گی۔ اکثر لوگوں
کو حادثے پیش آتے ہیں اور وہ گوناگوں مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں لیکن یہ
محض اتفاق کی بات ہے کہ وہ فن کے راستے پہ سے ہو کر گزرنے کی بجائے
کسی اور طرف مڑ لئے۔ صدر ہر جا کہ نشیند، صدر است۔ انہوں نے یا تو اپنے
مخصوص کام میں جھنڈے گاڑے اور یا تھک ہار کر جبنت کو سدھار ے۔ گویا
بے عزتی اور پے در پے حادثوں کے بعد کچھ کرنے، بن کر دکھانے کے
سلسلے اپنے ملک کے ہر اردو داں نوجوان کی طرح غزل کہنے کی کوشش کی۔
لیکن کسی نتیجے پہ نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ چھوٹی عمر ہی میں میری شادی ہو گئی
تھی... آپ میری بات سمجھے۔ کوئی معشوق میرے سامنے تھا ہی نہیں۔

اگر تھا تو مجھے بچہ سمجھ کر ٹال جاتا تھا۔ اگر وہ رُکے تو میری بیوی جو تاپکڑ کر اُسے نکال دیتی تھی۔ میں نے تو یہ پڑھ رکھا تھا کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے، اس لئے میں چپکے سے بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا اور کرتا ہی رہ گیا۔ میں نے ہجر و فغاں، وفا و بے وفائی، رقیب و محتسب کے مضمون شاعروں کے تتبع میں باندھے، مگر وہ سب مجھے جھوٹے اور کھوکھلے لگتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ محتسب تو میں خود ہوں۔ رقیب روسیاہ کی کیا مجال جو فرنگوں بھی میرے گھر کے پاس پھٹکے۔ یہ تو شادی کے ان لکھے معاہدے کی دوسری شق ہے۔ جس کی رو سے اگر رقیب کو قتل نہیں کیا جاسکتا، حالات تو بھجوایا جاسکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو فیض کی طرح رقیب کے ساتھ رشتہ پیدا کر سکتے ہیں، دراس کے افادی پہلو سے واقف ہیں گویا زندگی جو بھی تعلیم مروجہ شعر کے سلسلے میں دیتی تھی، میں اس میں کوراہی رہا۔ اس کے برعکس میڈم زندگی نے تلافی مافات میں مجھے دوسرے مسئلے دے دیئے۔ مثلاً خانہ داری کے مسئلے روزگار کے مسئلے جو کسی طرح بھی عشق کے مسائل سے کم نہ تھے۔ حالات میں ایسا جمود پیدا کر دیا اور بدن میں ایسی کپکپی کہ لاہور کے لنڈے بازار سے خریدا ہوا، مراسجا مراسجا اینڈ کو کا پرانا، پھٹا ہوا گرم کوٹ بھی مجھے نہ بچا سکا۔

بس، بہت ہولی۔ اب میں اپنی بات بند کرتا ہوں کہ گرم کوٹ کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا اور کیا نہ ہوا، یہ کچھ لوگ جانتے ہیں۔ بلکہ کیا نہیں ہوا کے

بارے میں انہیں مجھ سے زیادہ واقفیت ہے۔

• افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ہے تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع سے لے کر آخر تک چلتی ہے۔ بلتندی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بحیثیت فن شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے۔ پھر شعر، فی الخصوص غزل میں آپ عورت سے مخاطب ہیں، لیکن افسانے میں کوئی ایسی قباحت نہیں۔ آپ مرد سے بات کر رہے ہیں، اس لئے زبان کا اتنا رکھ رکھاؤ نہیں۔ غزل کا شعر کسی کھُرّے پن کا متحمل نہیں ہو سکتا، لیکن افسانہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ نثری نثر ادا ہونے کی وجہ سے اس میں کھردراپن ہونا ہی چاہیئے، جس سے وہ شعر سے میز ہو سکے۔ دنیا میں حسین عورت کے لئے جگہ ہے تو اکھڑ مرد کے لئے بھی ہے، جو اپنے اکھڑ پن ہی کی وجہ سے صنفِ نازک کو مرغوب ہے۔ فیصلہ اگرچہ عورت پہ نہیں، اگر وہ بھی کسی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی جو نقل میں بھی اس کی چال چلے۔ ہمارے نقادوں نے افسانے کو داد بھی دی تو نظم کے راستے سے ہو کر، نثر کی راہ سے نہیں۔ جس سے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کی ریل پٹڑی سے اتر گئی اور جو نہیں اتری تھی تو ایسی توصیف سے متاثر ہو کر انھوں نے خود، اپنے ہاتھوں سے اپنی لائن کے نٹ بولٹ ڈھیلے کر لئے۔

یہ طے بات ہے کہ افسانے کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے۔ آخری اتنی لمبی اور مسلسل بحر سے نبرد آزما ہونے کے لئے بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں تو چاہئیں ہی۔ باقی کی اصنافِ ادب، جن میں ناول بھی شامل ہے کی طرف جزواً جزواً توجہ دی جا سکتی ہے، لیکن افسانے میں جزو و کُل کو ایک ساتھ رکھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس کا ہراول، متداول اور آخری دستہ مل کر نہ بڑھیں تو یہ جنگ جیتی نہیں جا سکتی۔ شروع سے لے کر آخر تک لکھ لینے کے بعد پھر آپ ایک لفظ بڑھانے یا دو فقرے کاٹ دینے ہی کے لئے لوٹ سکتے ہیں۔ ایزاد و اضافے کی بہ نسبت میں نے بے خیالی میں قائم نہیں کی۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ افسانے میں ایزاد و اضافے سے زیادہ ضروری ہے آپ کو ان چیزوں کو قلم زد کرنا ہی ہو گا۔ جو بجلائے خود خوب صورت ہوں۔ اور مجموعی تاثر کو زائل کر دیں اور یا مرکزی خیال سے پرے لے جائیں۔

اب میں ایک چونکا دینے والی بات کہنے جا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اردو زبان نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ افسانے سے فنِ لطیف کو اس طریقے سے سمجھ سکے یا قبول کر سکے، جیسے سمجھنا یا قبول کرنا چاہیئے میری اس بات کو سمجھنے کے لئے آپ پیچھے مڑ کر دیکھیے کہ ہر آن آپ نے ڈکشن پہ کچھ زیادہ ہی زور دیا ہے۔ اس عمل کا گراف بنایا جائے تو وہ میرؔ، انیسؔ اور غالبؔ کے بعد داغؔ تک نیچے ہی آتا ہوا دکھائی دے گا معلوم ہوتا ہے۔ ہم

نے 'فسانۂ آزاد' کو افسانہ یا ناول ہی سمجھ کر پڑھا ہم نے اس کا مقابلہ VANITY FAIR سے کیا ہے۔ ہم نے آغا حشر کو ہندوستانی شیکسپیئر بھی کہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نے دونوں میں سے کسی ایک کو نہیں پڑھا اور اگر پڑھا تو فرق کو نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ پونا فلم اور ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ میں ممتحن کی حیثیت سے جب میں نے ایک امیدوار سے سوال کیا۔ آپ کو کون سے مصنف پسند ہیں تو اس نے آنکھ جھپکے بغیر جواب دیا۔ مجھے تو دو ہی پسند ہیں سر، گلشن نندہ اور شیکسپیئر!

کبھی 'ہمایوں'، اور 'ادبی دنیا' کے پرچے فیاض محمود اور عاشق بٹالوی کی توصیف میں کالے تھے۔ اور آج ہم ہی افسانے کی تاریخ میں ان بے چاروں کا ذکر نہیں کرتے۔ ہم نے افسانے میں زورِ بیان کو اس قدر سراہا ہے کہ ادب تو ایک طرف، خود ادیب کو نقصان پہنچایا ہے۔ افسانے میں اظہار کے تخلیقی مسائل میں سے سب سے بڑا مسئلہ گریز کا ہے۔ لیکن ہمارے شغب آشنا کان گریز کو عجزِ بیان کا نام دیتے ہیں۔ ہم ابھی تک داستان گوئی، فلسفہ رانی اور تاریخی واقعات کو آج یا کل کے کرداروں کی معرفت پیش کر دیئے جانے پر سر دھنتے ہیں۔ سر دھننے سے مجھے کچھ وہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو ہم کچھ بھی کر کے دُھنیں گے ہی کہ وہ ہماری عادتِ ثانیہ ہو چکی ہے۔ مگر تکلیف اس وقت ہوتی ہے، جب ہم خطیب، مؤرخ اور فلسفہ بردار کو ہی افسانہ نگار

کا نام دیتے ہیں۔

افسانہ کوئی سودیشی INDIGENOUS شئے نہیں۔ ہم نے جہاں تک کہانیاں لکھیں۔ کتھا کہت ساگر لکھی اور ہم سے لوگ انہیں مغرب سے گئے جہاں انہوں نے کہانی کو فن بنادیا۔ ہیئت میں بے شمار تجربے کئے، جن سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ہے۔ افسانے کے فن کو چھوڑیئے، کسی بھی فن کو جانچنے پرکھنے کے لئے عالمی پیمانے پر اسے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے یہاں کوئی علاحدگی ISOLATION نہیں ہے ملکوں اور قوموں کی حدیں نہیں ہیں۔ بشرطیکہ آپ منٹو کو موپساں اور مجھے چیخوف کے نام سے نہ پکارنے لگیں۔ حالانکہ یہ ممکن ہے میں خود کو کادا باٹا کہلوانا پسند کروں۔ آپ کو کیسا لگے اگر میں کہوں کہ رام لال اور جوگندر پال ہندوستان کے ہیرنش بوہل ہیں اور قرۃ العین حیدر ہان سویان۔ مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہان سویان کے ہموطن اسے اپنے دیس کی قرۃ العین حیدر کہیں۔

عجیب دھاندلی ہے! نامعلوم ہوتا ہے اُردو، اسم با مسمّا ہوتی جارہی ہے ہیرنش بوہل کا ایک کردار جو جج ہے، کہتا ہے۔

"..... ایسے مقدمے میں انصاف قسم کی کوئی چیز ہی نہیں، کیونکہ ملزم کا تقاضا ہی نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی آمریت ہے، جس میں [illegible] اظہار اور اخلاق ہمعصر مانی ANACHRONISTIC بات ہے۔"

مذکورہ ریاضت اور عالمی پیمانے پہ گمرہ دو پیش کی آگہی کے بعد ہی افسانے پر عبور حاصل ہوتا ہے اور جب یہ بات ہو جاتی ہے تو افسانہ لکھنے والے کے اضطرار (REFLEXES) کا حصّہ ہو جاتا ہے۔ نہ صرف آپ کی بے ارادہ بات سے افسانے کا مواد بل سکتا ہے، بلکہ، ہر موڑ، ہر نکڑ پہ افسانے بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ انہیں سمیٹتے ہوئے افسانہ نگار کے ہاتھ قلم ہو جائیں۔ بہر حال افسانوی تجربے پہ عبور حاصل ہو جانے کے بعد افسانہ نگار کو یونان کے اساطیری کردار می ڈاسن کا وہ لمس مل جاتا ہے، جس سے ہر بات سونا ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کا افسانہ نگار سوتے کو بھی چھوتا ہے تو وہ افسانہ ہو جاتا ہے۔ گھبراہٹ کی بات اس لئے نہیں کہ اتنا سونا پا کر می ڈاس بھی بھوکا مرا تھا۔

افسانہ لکھنے کے عمل میں بھولنا اور یاد رکھنا دونوں عمل ایک ساتھ چلتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ڈگیر یوں والے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ۔ اچھا افسانہ نہیں لکھ سکتے۔ کیونکہ انہیں بھول نہ سکنے کی بیماری ہے بس ایک دماغی تساہل کی طرف اشارہ کرتا ہوں جسے منٹو نے میرے نام ایک خط میں لکھا۔ بیدی، تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو۔ بس سمجھ گیا کہ منٹو کا مطلب ہے ـــــ میری کہانیوں میں

کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہے۔ مگر میں کیا کرتا؟ ایک طرف مجھے فن اور دوسری طرف زبان سے لوہا لینا تھا۔ اہلِ زبان اس قدر بے مروت نکلے کہ انہوں نے اقبال کا بھی لحاظ نہ کیا۔ کسی سے پوچھا آپ، اقبال سے ملے تو کیا بات ہوئی۔ بولے کچھ نہیں میں جی ہاں، جی ہاں، کہتا رہا اور وہ ہاں جی، ہاں جی کہتے رہے۔ اب حالات میں نسبتاً آسانی ہے۔ کیونکہ سندھ کے لئے ہمیں کہیں دور نہیں جانا ہے۔ پرسوں ہی ڈاکٹر نارنگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں ایک تحریک چلی ہے جو شوکت صدیقی اور قرۃ العین حیدر کی پورب سے آئی ہوئی زبان کو ٹکسالی نہیں مانتی بہرحال میں نے منٹو کی تنقید سے فائدہ اٹھایا اور دھیرے دھیرے اپنی کہانی سے ہاتھ کو مار بھگایا لیکن اس کا کیا کروں کہ وہ اِدھر اُدھر سے ہو کر پھر رونما ہو جاتا ہے۔ وہ بے اداتی کی ادا جس کی طرف منٹو نے اشارہ کیا میر کے الفاظ میں خاک ہی میں مل کر میسر آتی ہے لیکن یہی بے اداتی اور قلم برداشتگی جہاں منٹو اور کرشن چندر میں مزا پیدا کرتی تھی، وہیں بدمزگی بھی۔ منٹو کی تنقید کی وجہ سے میری حالت عورت کی سی تھی۔ جو مفتوح اور ناراج بھی ہونا چاہتی ہے اور پھر اس کا بدلہ لینا بھی۔ جب میں نے منٹو کے کچھ افسانوں میں لاابالی پن دیکھا تو انہیں لکھا —— منٹو! تم میں ایک بڑی بات ہے اور وہ یہ کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو اور نہ لکھتے وقت سوچتے ہو اور نہ لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔

اس کے بعد منٹو اور مجھ میں خط و کتابت بند ہو گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ انھوں نے میری تنقید کا اتنا بڑا نہیں مانا، جتنا اس بات کا کہ میں لکھوں گا خاک، جب کہ شادی سے پہلے مجھے کسی بات کا تجربہ ہی نہیں۔ اس پہ طرفہ میں نہ صرف بھینس کا دودھ پیتا ہوں بلکہ اسے پال بھی رکھا ہے۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ اگر اونٹ کا رشتہ مسلمان سے ہے تو گائے کا ہندو سے، تو سکھ کا بھی کسی سے ہو سکتا ہے۔

افسانہ ایک شعور، ایک احساس ہے، جو کسی میں پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اسے محنت سے حاصل تو کیا جا سکتا ہے، لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بہ دعا ہی رہتا ہے۔ کچھ وافر باتیں ھو ہضم کی وجہ سے بھی اس میں آ جاتی ہیں اور کچھ کسی اور ذہنی فنور سے ـــــ تسکین کی بات صرف اتنی ہے کہ افسانہ ابھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ایڈیٹر کے ہاتھ نہیں پہنچا۔ ہم اس میں ایزاد و اضافہ کر سکتے ہیں اور اس پہ بات نہ بنے تو پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں۔ اگر ہیمنگ وے پانچ سو صفحے لکھ کر ان میں سے صرف چھیانوے صفحے کا مواد نکال سکتا ہے۔ تو ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔

اردو میں بہت عمدہ افسانے لکھے گئے ہیں۔ اگر اُن کی تعداد گنی چُنی ہے

تو اس کی یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے تقاضے پورا کرنے میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ایمان ہاتھ سے جا رہا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ ہم اپنے ہی امیج کے قیدی ہو کر رہ گئے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی

نئی دہلی

۲۱ مارچ ۱۹۷۶ء

چند لمحے بیدی کی نئی کہانی کے ساتھ

راجندر سنگھ بیدی کے کردار اکثر و بیشتر محض زمان و مکان کے نظام میں مقید نہیں رہتے بلکہ اپنے جسم کی حدود سے نکل کر ہزاروں لاکھوں برسوں کے انسان کی زبان بولنے لگتے ہیں اس طرح ایک معمولی واقعہ، واقعہ نہ رہ کر انسان کے ازلی اور ابدی رشتوں کے بھیدوں کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ بیدی اس سے پہلے بھی عمرانیاتی معاہدوں کے دیئے گئے انسانی رشتوں کے ناموں کے بارے میں سوال اُٹھا چکے ہیں اور شادی کے مرکزی ادارے کی سماجی نوعیت اور معنویت کو معرض بحث میں لا چکے ہیں۔ زیر نظر کہانی میں بیدی نے اس سے بھی آگے جانے کی کوشش کی ہے اور رشتوں کے رشتے میں آبائی رشتے کے بارے میں بعض بنیادی سوال اُٹھاتے ہیں۔ عورت اور مرد کا رشتہ عروج

کو پہنچ کر ماں اور باپ کے رشتے میں ڈھلتا ہے اور اسی رشتے سے دوسرے سارے رشتے جڑے ہوتے ہیں۔ قدیم ہندستانی فکر کی رو سے بنیادی عنصر شکتی یعنی عورت یعنی جنس ہے۔ جو تخلیق کائنات کا مرتبہ ہے شکتی پر انحصار مادری بنیاد کی وجہ سے ہے۔ پدری بنیاد پر اصرار آریائی اور سامی اقوام سے لے کر جدید مغربی اقوام تک میں رائج ہے اس میں اصل عنصر آدم یعنی مرد ہے۔ یہ آویزش شاید کہانی لکھتے ہوئے بیدی کے تحت الشعور میں رہی ہو لیکن اصل سوال یہ ہے کہ جب سب رشتے ناتے عمرانیاتی معاہدوں کے طور پر امتداد زمانہ سے بن بنا گئے اور انسان نے انہیں قبول کر لیا ہے یعنی ان میں سے کسی کا تعلق فطری جبریت سے نہیں اور انسان نے انہیں سماجی سمجھوتوں کے طور پر اختیار کر رکھا ہے تو کیا انہیں پلٹا بدلا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ممکن ہو تو اس کے نتائج کیا ہوں گے، نیز کیا کوئی رشتہ ایسا بھی ہے جو عمرانیاتی معاہدوں سے بے نیاز ہو یعنی فطری جبریت سے متعلق ہو اور جس سے سب دوسرے رشتوں کے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں؟

بیدی مرد سے زیادہ عورت کے آرکی ٹائپ کے مرقع نگار ہیں، لیکن یہاں ماں کے ذکر سے بات نہ بنی، عورت خواہ وہ ماں ہو، بیٹی، بہن یا بیوی ہو، مرد کے وضع کردہ عمرانیاتی نظام میں وہ بکاؤ جنس ہے اور اس کا مول لچھے پیسے سے لے کر زندگی دے دینے تک سے چکایا جاتا ہے چنانچہ ماں کو بکاؤ کہنے

سے کوئی بات نہ بنتی، جب کہ "باپ بکاؤ ہے" کہنے سے بنیادی سوال قائم ہو جاتا ہے اور یک لخت ایک "تحیّر" زا صورت حال سامنے آجاتی ہے، یعنی عورت ماں، بیٹی، بہن، بیوی تو بِک سکتی ہے، لیکن کیا کبھی کوئی باپ بھی بکاؤ ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سماج کے رسم ورواج پر چوٹ پڑے گی یا کوئی بات اس کی توقعات کے خلاف ہوگی تو سب سے پہلے انتظامیہ یعنی پولیس والے پوچھ تاچھ کریں گے لیکن باپ گاندھرو داس موجود ہے اور پولیس سے صاف کہتا ہے کہ وہ بکنا چاہتا ہے۔

چنانچہ قانون بے بس ہے۔ گاندھرو داس کی بیوی کی موت ہو چکی ہے وہ اپنی زیادتیوں کو یاد کر کے راتوں میں اُٹھ جاتا ہے اور اپنا گریبان پھاڑ کر تیز تیز ٹہلتا ہے۔ اس کے بچے جو سب بڑے ہو چکے ہیں، اپنے اپنے کام سے لگ چکے ہیں وہ اپنے باپ کو رنڈوا نہیں "مرد بدھوا" کہتے ہیں۔ بیدی یہاں بھی طنز کرتے ہیں کہ بدھوا صرف عورت ہی نہیں مرد بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ سارا معاملہ اختیاری سہاروں کا ہے۔ اشتہار پڑھنے والے سوچتے ہیں اگر باپ خریدیں گے تو اس کو پالنا بھی پڑے گا، لیکن پالے بچے جاتے ہیں کہ باپ۔ نیز باپ تو وہ ہوتا ہے جس کے نطفے سے اس کا بیٹا ہو۔ عمرانیاتی نظام میں بیٹا تو حرامی بھی ہو سکتا ہے، لیکن کیا باپ بھی "حرامی" ہو سکتا ہے۔ گاندھرو داس کو خریدنے طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ ان میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو انسان سے

زیادہ اہم اس کے مذہب کو جانتے ہیں اور پہلا کام یہ کرنا چاہتے ہیں کہ گناہ میرو داس کا مذہب بدلا جاتے۔ خریدنے والوں میں عورتیں بھی ہیں۔ یہاں دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ جب مرد عورت کو خرید سکتا ہے تو کیا ہمارے سماجی سمجھوتے اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ عورت مرد کو خریدے۔ بیدی کے فن کا ایک خاص پہلو یوں کہ عورت اور مرد کے ازلی رشتے کے بھیدوں کی گرہ کشائی ہے، بیدی یہاں نہایت سہولت سے اشارہ کرتے ہیں کہ ہمارے سماجی معاہدوں نے عورت کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں جو" وہ کہتی ہے اس سے اُلٹ چاہتی ہے۔" اس میں بدن کو سُلانے اور روح کو جگانے کی صلاحیت ہی نہیں رہی جس طرح میر اپنے شعر شور انگیز سے پہچانے جاتے ہیں، بیرے نزدیک بیدی کی پہچان ان کے ایسے جملوں سے ہوتی ہے جہاں وہ انسانی روح کی گہرائیوں میں سفر کرتے ہیں۔ اردو کے افسانوی ادب میں ذیل کی قسم کے جملے بیدی ہی کے قلم سے نکل سکتے ہیں :

" تم پلنگ کے نیچے کے موسے ڈرتی ہو اور اسے چاہتی ہو۔ تم ایسی کنواریاں ہو جو اپنے دماغ میں عقت کی رٹ ہی سے اپنی عصمت کو بے جا رلٹواتی ہو... دراصل تمہارے بچے ہی غلط ہیں!"

"عورت کو کیا ہونا ہے جب وہ عورت نہیں رہتی۔ وہ مرد ہی سے اپنے عورت نہ رہ جانے کا بدلا لیتی ہے۔ وہ ایسے عین اس وقت

بیچ چوراہے میں ننگا اور ذلیل کرتی ہے۔ جب اسے عورت کی ضرورت ہو۔ وہ اس وقت اسے کوسنے دیتی ہے، جب وہ ناشتا کر کے باہر جانے کی تیاری کر رہا ہو۔ گویا باہر کی بے رحم دنیا سے لٹانے سے پہلے ہی وہ اسے ادھ موا کر دیتی ہے۔ پھر شام کو جب وہ اپنا مردہ کشاں کشاں گھر لاتا ہے تو پھر اسے جلی کٹی کا کفن اُڑھا کے لٹاتی اور خود رونے، بین کرنے میں تسکین پالیتی ہے۔"

یوں تو عمرانیاتی رشتوں کی چادر ہٹا دینے کے بعد عورت مرد کی کشش کا سارا معاملہ ہی اپنی نوعیت کے اعتبار سے اساطیری ہے۔ زیرِ نظر کہانی پڑھتے ہوئے بھی ذہن کئی مقدس اور غیر مقدس روایتوں کی طرف راجع ہوتا ہے، لیکن لگتا ہے کہ کہانی لکھتے ہوئے بیدی کے ذہن پر کچھ نہ کچھ یوجھ خدا کے آبائی تصور کا رہا ہوگا۔ کیونکہ اصل باپ اور بڑا باپ تو خدا ہی ہے اور حق تو یہ ہے کہ خدا بھی اپنے وجود کے لئے خریداروں یعنی اپنانے والوں کا محتاج ہے کیونکہ اگر خدا کو اپنانے والے نہ ہوں گے تو اسے تسلیم کون کرے گا۔ بنا بیٹے کے کون باپ ہو سکتا ہے۔ خدا کے آبائی تصور پر اصرار یوں تو تمام سامی مذہبوں میں ملتا ہے، لیکن سب سے واضح اصرار مسیحی روایت کا حصّہ ہے خدا اور خدا کا بیٹا اور تیسرا عنصر روح القدس۔ لیکن یہ سب مقدس ہی مقدس ہے۔ جب کہ خدا کے بیٹے تو گناہ کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہیں۔ سامی اور ہندستانی

روایتوں کے اس لطیف فرق سے بیدی اپنے تخلیقی عمل کے دوران مزولہ سرشار رہے ہوں گے۔ ابن مریم کو تو خدا کا بیٹا تسلیم کر لیا گیا لیکن خود مریم..... ازلی ماں۔ بیدی جس کے تحت الشعور کے نہاں خانوں میں شکنتلا بسی ہوئی ہے ازلی ماں کو کیسے بھول سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بیدی ازلی باپ کے آئینے میں کسی وحدت کی تلاش کر رہے ہوں۔ یعنی یہ کہ دوسرے تمام رشتے ایک ہی رشتے کی مختلف پرتیں ہیں۔ عورت خواہ وہ کسی بھی روپ میں آئے، عورت ہے اور مرد یعنی باپ کے وجود کو مکمل کرتی ہے اور باپ کا تصور ظل ہے خدا کے تصور کا، لیکن یہ ظل "خدا کا بیٹا" نہیں بلکہ گناہ آلودہ انسان ہے۔ دوسرے یہ کہ خدا یعنی اصل یا باپ بھی بذاتہٖ کچھ نہیں جب تک انسان اسے دل میں بٹھاتے نہیں، اور یہ کہ مکھ شانتی نہ باپ/ خدا کی ذات میں ہے نہ بیٹے/ خریدار کی ذات میں بلکہ قبول یعنی اپنانے کے عمل میں ہے۔

گاندھروداس اپنی پتنی کے بارے میں آخری خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ دوسری عورت کو دیکھتے ہی واویلا شروع کر دیتی ہے اور گھر سے باہر روتی چلاتی ہوئی بھاگتی جاتی ہے۔ پھر وہ لکڑی کی سیڑھی کے نیچے خود کو دفن کر لیتی ہے۔ مگر مٹی ہل رہی ہے اور وہ سانس لے رہی ہے۔ گاندھرو داس اپنی پتنی کو مٹی کے نیچے سے نکالتا ہے۔ یہ مٹی شاید موت کی نہیں، عورت مرد کے رشتے کے سرد ہو جانے کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی تصدیق

یوں ہوتی ہے کہ پتنی کے دونوں بازو غائب ہیں اور ناف کے نیچے دھڑ بھی نہیں۔ یعنی وہ جسمانی علائم ہی نہیں جن سے رشتہ استوار ہوتا ہے گاندھوداس پتلے سے پیار کرتا ہوا اسے زندگی کی سیڑھیوں سے اوپر تو لے آتا ہے۔ لیکن گاندھرو داس جو بہت بڑا گائک ہے، اس کا گانا اس واقعے کے بعد بند ہو جاتا ہے۔ اور یہ گانا برسوں بعد شروع ہوتا ہے اس وقت جب درد سے گاندھروداس کو باپ کی حیثیت سے خرید لیتا ہے اور آم کے پیڑوں پر بُور پڑتا ہے اور کوئل کوکتی ہے۔" بیدی کے ہاں موسم کا بیان مجرد حیثیت سے آ ہی نہیں سکتا وہ اسے ہمیشہ معنیاتی فضا کی توسیع کے لئے استعاراتی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے پہلے رشتوں کے زوال اور سرد مہری کا ذکر یت جھڑ کے مناظر میں بقا یہ سوکھے سڑے پتے اتنی تیزی سے گر رہے تھے کہ جھاڑو دینے والے اُٹھاتے اُٹھاتے تھک جاتے اور انہیں گھر لے جاکر جلانے کی بھی اجازت نہیں تھی،، کیونکہ رشتوں کے زوال کی سردی میں گرمی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا پت جھڑ میں چھیتا پڑنا بھی ہے تو اس دن جب پجاری مسکرا کر مہترانی چھبّو کو دیکھتا ہے اور اسے" پھول پتے "لے جانے کی اجازت دیتا ہے۔

بیدی نے اس کہانی میں انسانی رشتوں کو ایک ایسی پرزم سے گزارنے کی کوشش کی ہے جس کے بعد اگرچہ سب کی شکل بدل جاتی ہے لیکن رنگ سب کے نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ باپ تو بکا ہی بکا اور جب بکا یعنی دروے

نے رضاکارانہ طور پر گاندھرو داس کو باپ اختیار کر لیا تو دروے کو گاندھرو داس نے بھی رضاکارانہ طور پر بیٹا اختیار کر لیا۔ انسانی رشتوں کا یہ اختیاری مرقع مکمل ہوتا ہے۔ ایک ایسی عورت کے تصور سے جو نہ تو گاندھرو داس کی سماجی بیوی ہے نہ دروے کی سماجی ماں یعنی جو نہ نطفے کے رشتے کی سماجی بیٹی ہے نہ سماجی بہن ہے۔ لیکن باپ اور بیٹا اُسے بالترتیب ان حیثیتوں میں قبول کرتے اور برتتے ہیں۔ یہ عورت دیویانی ہے۔ بیدی کے اساطیری تخیل کی پرواز دیویانی کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ دیویانی سے معاً ازلی عورت کا تصور اُبھرتا ہے دیویانی اور یایاتی کے قصّے کے یوں تو کئی استعاراتی پہلو ہیں لیکن یہاں اس کی معنیاتی رمزیت یہی ہے کہ دیویانی جو شنکر کی بیٹی ہے، اسے برہسپتی کے بیٹے کچ کا، جس کی محبت میں وہ گرفتار ہو گئی تھی، شراپ ہے کہ اس کا ازدواجی/جنسی تعلق برہمن سے نہیں، کھتری سے ہو گا یعنی اس کا جنسی سفر سماجی معاہدوں کی ڈگر پر نہیں ہو گا۔ زیرِ نظر کہانی میں گاندھرو داس بھی شاید محض اتفاقی نام نہیں۔ گاندھروں کا گہرا رشتہ مرد کی ازلی اور جبلی خواہشات سے ہے وہ سُوریہ کی آگ کی تجسیم ہیں اور سنگیت، نرتیہ اور راگ رنگ کے رسیا۔ اندر کی محفلیں گاندھرو سجاتے ہیں اور تمام اپسرائیں ان کی محبوبائیں ہیں۔ گاندھروں کے برہما کی ناک یعنی خالق کی سانس سے یا ارشٹھا کے بطن سے پیدا ہونے کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، لیکن اتنی بات تمام روایتوں میں مشترک ہے کہ

گاندھرو جنسی و مادی لذتوں سے پیکر ہیں، سوم رس یعنی زندگی، اور صحت و قوت کا رس انہیں نے بنایا۔ اوران کی سب سے بڑی کمزوری عورت ہے۔ گاندھرو داس اور دیویانی کا تعلق ذہن کو عورت مرد کے ازلی رشتے کی طرف موڑ دیتا ہے دیویانی اپنی سہیلی سرمشٹھا سے اپنی بے عزتی کا بدلا لینے کے لئے اسے اپنی ملازمہ تو بنا لیتی ہے لیکن یایاتی کو اسی سرمشٹھا سے محبت ہو جاتی ہے اور اس کی ہوس اتنی بڑھتی ہے کہ وہ اپنے بیٹوں سے جوانی اُدھار لے کے ہزار برس تک جوان رہتا ہے اور جسمانی اور مادی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے دیویانی اگرچہ عمر میں گاندھرو داس کی بیٹی سے بھی چھوٹی ہے لیکن گاندھرو داس عمر کے زوال کی منزل میں بھی اس سے تمام رشتوں کی لذتوں کا کسب فیض کرتا ہے۔

"میرے پتا در اصل عورت کی جات ہی سے پیار کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، جیسے انہوں نے پرکرتی کے چوتن دیکھ لئے ہیں، جن کے جواب میں وہ مسکراتے ہیں اور کبھی کبھی بیچ میں آنکھ بھی مار دیتے ہیں۔ انہیں شبد بیٹی، بہو، بھابی، چاچی، للی، بیا سب اچھے لگتے ہیں وہ بہو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کے گال بھی چوم لیتے ہیں اور یوں قید میں آزادی پا لیتے ہیں اور آزادی میں قید۔"

دیویانی کی ایک سطح یہ ہے کہ وہ پرکرتی ہے اور گاندھرو داس پرش۔

دیویانی یعنی پرکرتی پرسش کے مقابلے میں ہمیشہ نوخیز رہتی ہے۔ بیدی کہتے ہیں دیویانی بچپن ہی سے آوارہ ہو گئی تھی جب سے اس کا باپ مرا تھا تب سے وہ گھر اکیلے مردسے دوسرے، دوسرے سے تیسرے کے پاس جاتی ہے۔ "اس کا بدن ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا لیکن روح تھی کہ تھکتی ہی نہ تھی.... دیویانی کو دراصل باپ کی تلاش تھی۔"

بیدی کی کہانی اسی چونکا دینے والے احساس کے ساتھ مکمل ہوتی ہے کہ اصل رشتہ ایک ہی ہے، خلق کرنے کے PROCESS کا، جس کا دوسرا رُخ اپنانا اور قبولنا ہے۔ یہی رشتہ پرش اور پرکرتی کا ہے۔ خدا اور خدا کے رشتے کا جو مسیحی استعارہ کہانی کے شروع میں اُبھرا تھا، اب اپنے پھیلاؤ اور انکاؤ کے ساتھ سامنے آ جاتا ہے، کیونکہ درمے کا ورکس بنیچر قلب کیتھولک ہے خدا اور خدا کے بیٹے کا مقدس آبائی رشتہ تو اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے، لیکن اس کا ذہن ایسے کسی آبائی تصور کو قبول نہیں کر سکتا جس کی تکمیل کے لئے جنس یعنی دیویانی کے وجود کی اتنی ہی ضرورت ہو جتنی خدا کی، یہ گناہ آلود، جنس کو تقدس کا درجہ صرف ہندستانی روایت میں حاصل ہے اور تقدس بھی ایسا جو خدا یعنی آبائی باپ کا حصّہ ہے۔ چنانچہ گاندھرو داس پرش ہے اور دیویانی پرکرتی ازلی عورت، ازلی ماں، مریم یعنی وہ مریم جو پرش اور پرکرتی کے رشتے بن بر کرتی ہے اور تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ رشتہ صرف ایک ہے۔ اس کے تمام دوسرے

روپ ہمارے عمرانیاتی نظام اور فلسفوں کی بنائی ہوئی قیدیں ہیں" میرا بیٹا وہ بھی باپ ہے"، تبھی تو بیدی کہتے ہیں" تم انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، صرف محسوس کرو" درد سے سمجھنے سوچنے کے پھیر میں نہیں پڑتا۔ وہ محسوس کرتا ہے اس کو آنکھیں ملانے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ " وہ بس اپنا لیتا ہے" اپنانے اور قبولنے کا یہ عمل ہی اعتقاد ہے اور اسی کی دولت سے سرشار ہوکر درد ے کہتا ہے کہ جب سے اس نے گاندھر وداس کو باپ کیا ہے یعنی قبولا ہے۔ تب سے گاندھر وداس کی نگاہوں کے مرہم سے اسے کتنی شانتی کتنی ٹھنڈک ملتی ہے۔ وہ جو ہر وقت ایک بے نام ڈر سے کانپتا رہتا تھا، اب نہیں کانپتا۔ اسے ہر وقت اس بات سے تسلّی رہتی ہے ـــــ وہ تو ہے۔۔۔" گویا نام ڈھکوسلے ہیں، رشتہ صرف ایک ہے اپنانے اور قبولنے کا۔ اسی سے زندگی میں سکھ شانتی کے دریچے کھلتے ہیں اور ٹھنڈک ملتی ہے۔ بیدی کا یہ اتیانہ یہاں بھی قائم ہے کہ عام قاری کے لئے تو کہانی کی واقعاتی سطح پر دلچسپی کا خاصا سامان موجود ہے لیکن کہانی کا فکری اور استعاراتی نظام بھی اپنی جگہ پر ہے اگرچہ اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے ذوق و ظرف کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

ایک باپ بکاؤ ہے

دیکھی نہ سُنی یہ بات جو ۲۴ فروری کے "ٹائمز" میں چھپی۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اخبار والوں نے چھاپ کیسے دی۔ خرید و فروخت کے کالم میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی اشتہار تھا۔ جس نے وہ اشتہار دیا تھا۔ ارادہ یا اس کے بغیر اسے معمّے کی ایک شکل دے دی تھی۔ پتے کے سوا اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی، جس سے خریدنے والے کو کوئی دلچسپی ہو۔ بکاؤ ہے ایک باپ عمر اکہتّر سال، بدن اکہرا، رنگ گندمی، دمے کا مریض۔ حوالہ باکس نمبر ایل ۴۷۶، معرفت "ٹائمز"

اکہتّر برس کی عمر میں باپ کہاں رہا۔۔۔ دادا نانا ہوگیا وہ تو؟!
عمر بھر آدمی ہاں ہاں کرتا رہتا ہے، آخر میں نانا ہو جاتا ہے۔

باپ خرید لاتے تو ماں کیا کہے گی، جو بیوہ ہے۔ عجیب بات ہے نا ایسے ماں باپ جو میاں بیوی نہ ہوں۔

ایک آدمی نے اُلٹا پاتو دینا کا سفر شروع کر دیا ہے آج کی دنیا میں سب سچ ہے بھائی، سب سچ ہے۔

دمہ پھیلائے گا۔

نہیں ہے۔ دمہ متعدی بیماری نہیں۔

ہے۔

نہیں۔

ہے۔

ان دو آدمیوں میں چاقو چل گئے۔ جو بھی اس اشتہار کو پڑھتے تھے بڈھے کی شکل پہ ہنس دیتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اسے ایک طرف رکھ دیتے اور پھر اُٹھا کر اسے پڑھنے لگتے جیسے ہی انہیں اپنا آپ احمق معلوم ہونے لگتا، وہ اس اشتہار کو اڑوسیوں پڑوسیوں کی ناک کے ٹھونس دیتے۔

ایک بات ہے۔ گھر میں چوری نہیں ہو گی۔

کیسے ؟

ہاں، کوئی رات بھر کھانستا رہے۔

یہ سب سازش ہے، خواب آور گولیاں بیچنے والوں کی۔

پھر ــــ اک باپ بکاؤ ہے!

یوں لوگ ہنستے ہنستے رونے کے قریب پہنچ گئے۔

گھروں میں، راستوں پر، دفتروں میں بات ڈاک ہونے لگی، جس سے وہ اشتہار اور بھی مشتہر ہو گیا

جنوری فروری کے مہینے بالعموم پت جھڑ کے ہوتے ہیں۔ ایک ایک داڑھی کے نیچے بیس بیس جھاڑو دینے والے، سڑکوں پر گرے سوکھے سڑے، بوڑھے پتّے اُٹھاتے اُٹھاتے تھک جاتے ہیں، جنہیں اُن کو گھر لے جانے کی بھی اجازت نہیں کہ انہیں جلائیں اور سردی سے خود اور اپنے بال بچوں کو بچائیں۔ اس پت جھڑ اور سردی کے موسم میں وہ اشتہار گرمی پیدا کرنے لگا جو آہستہ آہستہ سینک میں بدل گئی۔

کوئی بات تو ہوگی؟!

ہو سکتا ہے، پیسے جائیداد والا۔۔۔

بکواس ــــ ایسے میں بکاؤ لکھتا؟

مشکل سے اپنے باپ سے خلاصی پاتی ہے۔ باپ کیا تھا۔ چنگیز بلاکو تھا سالا۔

تم نے پڑھا۔ مسز گوسوامی؟

دھت ــــ ہم بچّے پالیں گی، بڈھا، کہ باپ؟ ایک اپنے ہی وہ کم نہیں گو۔ سوامی ہے! ہی۔۔۔ ہی ہی

باپ بھی حرامی ہوتے ہیں۔۔۔۔

باکس ایل ۷۶ ۴ میں چھٹیوں کا طومار آیا پڑا تھا۔ اس میں ایک ایسی چھٹی بھی چلی آئی تھی، جس میں کیرل کی کسی لڑکی مِس اونی کرشنن نے لکھا تھا کہ وہ الیوداہی میں ایک نرس کا کام کرتی رہی ہے اور اس کے ایک بچّہ ہے۔ وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ شادی کی متمنی ہے جس کی آمدنی معقول ہو اور جو اس کی اور بچّے کی مناسب دیکھ بھال کر سکے چاہے وہ کتنی عمر کا ہو۔۔۔ اس کا کوئی شوہر ہو گا جس نے اسے چھوڑ دیا۔ یا ویسے الیوداہی کے کسی شیخ نے اُسے اُلٹا پلٹا دیا چنانچہ غیر متعلق ہونے کی وجہ سے وہ عرضی ایک طرف رکھ دی گئی کیونکہ اس کا لکاو باپ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہرحال ان چھٹیوں سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہیڈلے چیز، داین سن، ارونگ اور اگا تھا کرسٹی کے سب پڑھنے والے اِدھر پلٹ پڑے ہیں۔ کلاسی فائیڈ اشتہار چھاپنے والوں نے جنرل منیجر کو تجویز پیش کی کہ اشتہاروں کے نرخ بڑھا دیئے جائیں۔ مگر نوجوان بڈھے یا بُڈھے نوجوان منیجر نے تجویز کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔ SHUCKS! ایک پاپولر اشتہار کی وجہ سے نرخ کیسے بڑھا دیں؟۔۔۔۔۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

پولیس پہنچی۔ اُس نے دیکھا ہندو کالونی، دادر میں گاندھرو داس، جس نے

اشتہار دیا تھا، موجود ہے اور صاف کہتا ہے کہ میں بکنا چاہتا ہوں۔ اگر اس میں کوئی قانونی رنجش ہے تو بتایئے ــــ وہ پان پہ پان چباتا اور اِدھر اُدھر دیواروں پہ تھوکتا جا رہا تھا۔ مزید تفتیش سے پتا چلا کہ گاندھرو داس ایک گائیک تھا، کسی زمانے میں جس کی گائیکی کی بڑی دھوم تھی۔ برسوں پہلے اس کی بیوی کی موت ہو گئی ہے جس کے ساتھ اس کی ایک منٹ نہ پٹتی تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک اندھی محبت میں بندھے ایک دوسرے کو چھوڑتے بھی نہ تھے۔ شام کو گاندھرو داس کا ٹھیک آٹھ بجے گھر پہنچنا ضروری تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی لین دین نہ رہ جانے کے باوجود یہ احساس ضروری تھا کہ ــــ وہ ہے۔ گاندھرو داس کی تان اڑتی ہی صرف اس لئے تھی کہ دمینتی، اس کے سنگیت سے بھرپور نفرت کرنے والی بیوی گھر میں موجود ہے اور اندر کہیں گاجر کا حلوا بنا رہی ہے اور دمینتی کے لئے یہ احساس تسلی بخش تھا کہ اس کا مرد جو برسوں سے اسے نہیں بُلاتا، ساتھ کے بستر پہ پڑا، شراب میں بدمست خراٹے لے رہا ہے۔ کیونکہ خراٹا ہی ایک موسیقی تھی، جسے گاندھرو کی بیوی سمجھ پائی تھی۔

بیوی کے چلے جانے کے بعد گاندھرو داس کو بیوی کی تو سب زیادتیاں بھول گئیں لیکن اپنے اس پہ کئے ہوئے اتیاچار یاد رہ گئے۔ وہ بیچ رات کے ایکا ایکی اُٹھ جاتا اور گریبان پھاڑ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگتا۔ بیوی کے بارے میں

آخری خواب میں اس نے دیکھا کہ دوسری عورت کو دیکھتے ہی اس کی بیوی نے واویلا مچا دیا ہے اور روتی چلاتی ہوئی گھر سے بھاگ نکلی ہے۔ گاندھرو داس پیچھے دوڑا۔ لکڑی کی سیڑھی کے نیچے کچی زمین میں دیمک نے اپنے آپ کو دفن کر لیا۔ مگر مٹی ہل رہی تھی اور اس میں دراڑیں سی چلی آتی تھیں، جس کا مطلب تھا کہ ابھی اس میں سانس باقی ہے۔ حواس باختگی میں گاندھرو داس نے اپنی عورت کو مٹی کے نیچے سے نکالا تو دیکھا ــــ اس کی، بیوی کے دونوں بازو غائب تھے۔ ناف سے نیچے بدن نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ اپنے ٹھنٹ اپنے پتی کے گرد ڈالے اس سے چمٹ گئی اور گاندھرو داس اُسی پتلے سے پیار کرتا ہوا اُسے سیڑھیوں سے اُوپر لے آیا۔

گاندھرو داس کا گانا بند ہو گیا!

گاندھرو داس کے تین بچے تھے ــــ تھے کیا ہیں۔ سب سے بڑا ایک نامی پلے بیک سنگر ہے، جس کے لانگ پلینگ ریکارڈ بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ ایرانی ریستورانوں میں رکھے ہوئے جُوک باکسوں سے جتنی فرمائشیں اس کے گانوں کی ہوتی ہیں اور کسی کی نہیں۔ اس کے برعکس گاندھرو داس کے کلاسیکی میوزک کو کوئی گھاس بھی نہ ڈالتا تھا۔ دوسرا لڑکا اوف سیٹ پرنٹر ہے اور جست کی پلیٹیں بھی

بناتا ہے۔ پریس سے وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ مہینہ پاتا ہے اور اپنی اطالوی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کوئی بیچنے بام رے اُسے اس بات کا خیال ہی نہیں۔ جس زمانے میں گاندھرو داس کا موسیقی کے ساز بیچنے کا کام ٹھپ ہوا تو بیٹا بھی ساتھ تھا۔ گاندھرو نے کہا ــــ چلو، ایچ۔ ایم۔ وی کے ریکارڈوں کی ایجنسی لیتے ہیں۔ چھوٹے نے جواب دیا ــــ ہاں، مگر آپ کے ساتھ میرا کیا مستقبل ہے؟ گاندھرو داس کو دھچکا سا لگا۔ وہ بیٹے کا مستقبل کیا بتا سکتا تھا؟ کوئی کسی کا مستقبل کیا بتا سکتا ہے؟ گاندھرو کا مطلب تھا کہ میں کھاتا ہوں تو تم بھی کھاؤ۔ میں بھوکا مرتا ہوں تو تم بھی مرو۔ تم جوان ہو، تم میں حالات سے لڑنے کی طاقت زیادہ ہے۔ اس کے جواب کے بعد گاندھرو داس ہمیشہ کے لئے چپ ہوگیا۔ رہی بیٹی تو وہ ایک اچھے مارواڑی گھر میں بیاہی گئی۔ جب وہ تینوں بہن بھائی ملتے تو اپنے باپ کو رنڈوا نہیں، مرد بدھوا کہتے اور اپنی اس اختراع پہ خود ہی ہنسنے لگتے۔

ایسا کیوں؟

چانتک، ایک شاعر اور اکاؤنٹنٹ جو اس انتہا کے سلسلے میں گاندھرو داس کے ہاں گیا تھا، کہہ رہا تھا ــــ اس بڈھے میں ضرور کوئی خرابی ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین اولادوں میں سے ایک بھی اس کی دیکھ ریکھ نہ کرے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے اتنے نزدیک تھے کہ دور ہوگئے؟ ہندوؤں

بیں اُلجھے رہنے کی وجہ سے کوئی چانزک کے الہام اور الفاظ کے درمیان فساد پیدا ہوگیا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں کنبے کا تصور ٹوٹتا جا رہا ہے۔ بڑوں کا ادب ایک فیوڈل بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سنے سب بڈھے کسی ہائیڈرک پارک میں بیٹھے، امتداد زمانہ کی سردی سے ٹھٹھرے ہوئے، ہر آنے جانے والے کو شکار کرتے ہیں، کہ شاید اُن سے کوئی بات کرے وہ یہودی ہیں جنہیں کوئی ہٹلر ایک ایک کر کے گیس چیمبر میں دھکیلتا جا رہا ہے۔ مگر دھکیلنے سے پہلے جمہور کے ساتھ ان کے دانت نکال لیتا ہے جن پہ سونا مڑھا ہے یا اگر کوئی بچ گیا ہے تو کوئی بھانجا بھتیجا اتفاقیہ طور پہ اس بڈھے کو دیکھنے کے لئے اس کے مخروطی اٹیک میں پہنچ جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ تو مرا پڑا ہے اور اس کی فلزاتی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہیں۔ نیچے کی منزل والے بدستور اپنا اخبار بیچنے کا کاروبار کر رہے ہیں۔ کیونکہ دُنیا میں روز کوئی نہ کوئی واقعہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر آ کر تصدیق کرتا ہے کہ بڈھے کو مرے ہوئے پندرہ دن ہو گئے ہیں۔ صرف سردی کی وجہ سے لاش گلی سڑی نہیں۔ پھر وہ بھانجا یا بھتیجا کمیٹی کو خبر کر کے منظر سے ٹل جاتا ہے مبادا آخری رسوم کے اخراجات اُسے دینے پڑیں۔

چانزک نے کہا ــــ ہو سکتا ہے، بڈھے نے کوئی اندوختہ رکھنے کی بجائے اپنا سب کچھ بچوں ہی پر لُٹا دیا ہو۔ اندوختہ ہی ایک بولی ہے، جسے دنیا کے

لوگ سمجھتے ہیں اور ان سے زیادہ اپنے سگے سمندھی، اپنے ہی پیچھے بالے۔ کوئی سنگیت میں تار سے توڑ لائے، نقاشی میں کمال دکھا جائے اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ پھر اولاد ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا باپ وہی کہے جس سے وہ اولاد خوش ہو۔ باپ کی خوشی کس بات میں ہے، اس کی کوئی بات ہی نہیں اور ہمیشہ ناخوش رہنے کے لئے اپنے کوئی سا بھی بے گانہ بہانہ تراش لیتے ہیں۔

مگر گاندھروداس تو بڑا ہنس مکھ آدمی ہے۔ ہر وقت لطیفے سناتا، خود ہنستا اور دوسروں کو ہنساتا رہتا ہے۔ اس کے لطیفے اکثر فحش ہوتے ہیں۔ شاید وہ کوئی نقاب، مکھوٹے ہیں جن کے پیچھے وہ اپنی جنسی ناکامیوں اور ناآسودگیوں کو چھپاتا رہتا ہے۔ یا پھر سیدھی سی بات ــــــ بڑھاپے میں انسان ویسے ہی ٹھرکی ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقی یا مفروضہ فتوحات کی بازگشت۔

اشتہار کے سلسلے میں آنے والے کچھ لوگ اس لئے بھی بدک گئے کہ گاندھروداس پر پچپن ہزار کا قرض بھی تھا، جو بات اس نے اشتہار میں نہیں لکھی تھی اور غالباً اس کی عیاری کا ثبوت تھی۔ اس پہ طرفہ ایک جوان لڑکی سے آشنائی بھی تھی جو عمر میں اس کی اپنی بیٹی رما سے چھوٹی تھی۔ وہ لڑکی، دیویانی، گانا سیکھنا چاہتی تھی جو گرو جی نے دن رات ایک کر کے اسے سکھا دیا اور سنگیت کی دنیا کے شکھر پہ پہنچا دیا۔ لیکن ان کی عمروں کے بعد کے باوجود ان کے

تعلقات میں ہیجانی کیفیت تھی، اسے دوسرے تو ایک طرف، خود وہ بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ اب بھلا ایسے چاروں عیب شرعی باپ کو کون خریدے؟ اور پھر ——— جو ہر وقت کھانستا رہے، کسی وقت بھی دم اُلٹ جائے اس کا۔

باہر جائے تو ٹانک مار کے آئے۔ بلکہ لوٹتے وقت پوا بھی دھوتی میں چھپا کر لے آئے۔

آخر ——— دمے سے مریض کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔

گاندھرو داس سنگیت سکھاتے ہوئے یہ بھی کہہ اُٹھتا ——— میں پھر گاؤں گا۔ وہ مکرارے کے ساتھ یہ بات شاید اس لئے بھی کہتا کہ اسے خود بھی اس میں یقین نہ تھا۔ وہ سُر لگاتا بھی تو اسے اپنے سامنے اپنی مرحوم بیوی کی روح دکھائی دیتی ——— جیسے کہہ رہی ہو ——— ابھی تک گا رہے ہو؟

اس انوکھے مطالبے اور امتزاج کی وجہ سے لوگ گاندھرو داس کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی بہت چمکتی، دمکتی ہوئی شے ہو اور جس کا نقش وہاں سے ٹل جانے کے بعد بھی کافی عرصے تک آنکھ کے اندر پردے پر برقرار رہے اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑے جب تک کوئی دوسرا عنصری نظارہ پہلے کو دھندلا نہ دے۔

کسی خورشید عالم نے کہا ——— میں خریدنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ

مسلمان ہو جائیں۔

مسلمان تو میں ہوں ہی۔

کیسے؟

میرا ایمان خدا پہ مسلّم ہے۔ پھر بس نے جو پایا ہے، اُستاد علاء الدین کے گھرانے سے پایا ہے۔

آں ہاں۔ وہ مسلمان ——— کلمے والا . . . .

کلمہ تو سانس ہے انسان کی جو اس کے اندر باہر جاری اور ساری ہے میرا دین سنگیت ہے۔ کیا استاد عبدالکریم خاں کا باباہری داس ہونا ضروری تھا؟

پھر میاں خورشید عالم کا پتہ نہیں چلا۔

دو تین عورتیں بھی آئیں۔ لیکن گاندھرو داس جس نے زندگی کو لوٹانک بنا کے پی لیا تھا، بولا ——— جو تم کہتی ہو، عین میں اُس سے اُلٹ چاہتی ہو۔ کوئی بنا تجربہ جس سے بدن سو جلئے اور روح جاگ اُٹھے، اسے کہنے کی تم میں ہمت ہی نہیں۔ دین، دھرم، معاشرہ نہ جانے کن کن چیزوں کی آڑ لیتی ہو، لیکن بدن روح کو تکنکھے میں کس کے یوں سامنے پھینک دیتا ہے۔ تم پلنگ کے نیچے کے مرد سے ڈرتی ہو اور اسے ہی چاہتی ہو۔ تم ایسی کنواریاں ہو جو اپنے دماغ میں عفت ہی کی رٹ سے اپنی عصمت لٹواتی ہو، اور وہ بھی بے جماع . . . اور

پھر گاندھر وداس نے ایک شیطانی مسکراہٹ سے کہا ــــ دراصل تمہارے سمجھنے میں غلطی ہے!

اُن عورتوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ازلی مائیں دراصل باپ نہیں، کسی خدا کے بیٹے کی تلاش میں ہیں۔ ورنہ تین تین چار چار تو ان کے اپنے بیٹے ہیں، مجاز کی اس دنیا میں....

میں اُس دن کی بات کرتا ہوں، جس دن بان گنگا کے مندر سے بھگوان کی مورتی چوری ہوئی۔ اُس دن بت جھڑ بہار پر تھی۔ مندر کا پورا احاطہ سوکھے سڑے بوڑھے پتوں سے بھر گیا۔ کہیں شام کو بارش کا ایک چھینٹا پڑا اور چوری سے پہلے مندر کی چوتیوں پہ پروانوں نے اتنی ہی فراوانی سے قربانی دی جس فراوانی سے قدرت انہیں پیدا کرتی اور پھر ان کی کھاد بناتی ہے۔ یہ وہی دن تھا جس دن پجاری نے پہلے بھگوان کرشن کی رادھا جو عمر میں اپنے عاشق سے بڑی تھی، کی طرف دیکھا اور مسکرا کر مہترانی جھنّو کی طرف (جو عمر میں پجاری کی بیٹی سے چھوٹی تھی) اور وہ پتے اور پھول ادبیچ گھر لے گئے۔

مورتی تو خیر کسی نے سونے چاندی، ہیرے اور پنّوں کی وجہ سے چرا لی، لیکن گاندھر وداس کو لارسن اینڈ لارسن کے مالک دردوے نے بے وجہ خرید لیا گاندھر وداس اور دردوے میں کوئی بات نہیں ہوتی۔ بوڑھے نے صرف آنکھوں

ہی آنکھوں میں اُسے کہہ دیا ـــ جیسے تیسے بھی ہو، مجھے لے لو بیٹے. بنا بیٹے کے کوئی باپ نہیں ہو سکتا. اس کے بعد دُردے کو آنکھیں ملانے، سوال کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی. سوال شرطوں کا تھا مگر شرطوں کے ساتھ کبھی زندگی جی جا تی ہے؟ دُردے نے گاندھر وداس کا قرض چکایا، سہارا دے کر اسے اُٹھایا اور مالابار ہل کے دامن میں اپنے عالی شان بنگلے رگہری کنج میں لے گیا جہاں وہ اس کی تیمار داری اور خدمت کرنے لگا۔

دُردے سے اس کے ملازموں نے پوچھا ـــ سر، آپ یہ کیا مصیبت لے آئے ہیں. یہ بڑھا مطلب، بابو جی آپ کو کیا دیتے ہیں؟

کچھ نہیں. بیٹھے رہتے ہیں آلتی پالتی مارے. کھانستے رہتے ہیں اور یا پھر زردے قوام والے پان چبائے جاتے ہیں. جہاں جی چاہے، تھوک دیتے ہیں جس کی عادت مجھے اور میری صفائی پسند بیوی کو ابھی نہیں پڑی ہے، مگر پڑ جائے گی ـــ دھیرے دھیرے... مگر تم نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں؟

جی نہیں -

جاؤ، دیکھو، ان کی روتی ہنستی آنکھوں میں کیا ہے. ان میں سے کیسے کیسے سندلیس نکل کر کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟

کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟ ـــ جمناداس، دُردے کے ملازم نے غیرارادی طور پر فضا میں دیکھتے ہوئے کہا ـــ آپ تو سانتسدان ہیں!

بس سائنس ہی کی بات کر رہا ہوں، جمنا! اگر انسان کے زندہ رہنے کے لئے پھل پھول اور پیڑ پودے ضروری ہیں، جنگل کے جانور ضروری ہیں، بچے ضروری ہیں تو بوڑھے بھی ضروری ہیں۔ ورنہ ہمارا ایکولاجیکل بیلنس تباہ ہو کر رہ جائے۔ اگر جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر بے وزن ہو کر انسانی نسل ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے۔

جمنا داس اور اتھاولے بجاد کچھ سمجھ نہ سکے۔

دُروے نے بنگلے میں لگے اشوک پیڑ کا ایک پتا توڑا اور جمنا داس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ــــ اپنی پوری سائنس سے کہو کہ یہ تازگی، یہ شگفتگی، یہ شادابی اور یہ رنگ پیدا کر کے دکھائے....

اتھاولے بولا ــــ وہ تو اشوک کا بیج بوئیں....

آں ہاں ــــ دُروے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں بیج کی نہیں، پتے کی بات کر رہا ہوں۔ بیج کی بات کریں گے تو ہم خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔

پھر جمنا داس کے قریب ہوتے ہوئے دُروے بولے ــــ میں تمہیں کیا بتاؤں، جمنا! جب میں باپو جی کے چرن چھو کر جاتا ہوں تو ان کی نگاہوں کا مرہم مجھے کتنی شانتی، کتنی ٹھنڈک دیتا ہے میں جو ہر وقت ایک بے نام ڈر سے کانپنے لگا تھا اب نہیں کانپتا۔ مجھے ہر وقت اس بات کی تسلی رہتی ہے۔

وہ تو ہیں۔ مجھے یقین ہے، بابوجی کی آتما کو بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہوگا!

بس نہیں مانتا، سر، ـــــ یہ خالی خولی جذباتیت ہے۔

ہو سکتا تھا، دُروے بھڑک اُٹھتا۔ ہو سکتا تھا وہ جمناداس، اپنے ملازم کو اپنی مرم سے ڈسمس کر دیتا۔ لیکن باپ کی آنکھوں کے مرم نے اُسے یہ نہ کرنے دیا۔ اُلٹا اس کی آواز میں کہیں سے کوئی کومل سُر چلا آیا اور اُس نے بڑے پیار سے کہا ـــــ تم کچھ بھی کہہ لو، جمنا۔ یہ ایک بات تو تم جانتے ہو۔ میں جہاں جاتا ہوں، لوگ مجھے سلام کرتے ہیں۔ میرے سامنے سر جُھکاتے رکھ بچھ بچھ جاتے ہیں۔

دُروے اس کے بعد ایکا ایکی چُپ ہو گیا۔ اُس کا گلا اور اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

سر، میں بھی تو یہی کہتا ہوں ـــــ دُنیا آپ کے سامنے سر جُھکاتی ہے!

اس لئے۔۔۔ دُروے نے اپنی آواز پاتے ہوئے کہا ـــــ کہیں میں بھی اپنا سر جھکانا چاہتا ہوں۔ اتھا ولے، جمناداس، اب تم جاؤ۔ پلیز! میری پُوجا میں وِگھن نہ ڈالو۔ ہم نے بہتر سے خدا پایا ہے۔

گھری کنج میں لگے ہوئے آم کے پیڑوں پر لوہ پڑا۔ اِدھر پہلی کوئل کُوکی اُدھر گاندھرو داس نے برسوں کے بعد تان اُٹھائی ـــــ کوئلیا بولے امبوا کی ڈار۔۔۔

وہ گانے لگے۔ کسی نے کہا۔ آپ کا بیٹا آپ سے اچھا گاتا ہے۔

ایسا؟... گاندھرو داس نے بمبئیا بولی میں کہا۔ آخر میرا بیٹا ہے۔ باپ نے میٹرک کیا ہے تو بیٹا ایم اے۔ نہ کرے؟

ایسی باتیں کرتے ہوئے ناسمجھ، بے باپ کے لوگ گاندھرو داس کے چہرے کی طرف دیکھتے کہ اُن کی جھرّیوں میں کہیں تو جلن دکھائی دے۔ جب کوئی ایسی چیز نظر نہ آتی تو کسی نے لقمہ دیا۔ آپ کا بیٹا کہتا ہے، میرا باپ مجھ سے جلتا ہے۔

سچ؟ میرا بیٹا کہتا ہے۔

ہاں، میں جھوٹ تھوڑے بول رہا ہوں۔

گاندھرو داس تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ جیسے وہ کہیں اندر عالم ارواح میں چلے گئے ہوں اور وہاں سے بیٹے کی شکایت کی ہو۔ بڑھاپے کوئی جواب پا کر وہ دھیرے سے بولے۔ اور تو کوئی بات نہیں، میرا بیٹا۔ وہ بھی باپ ہے... وہ پھر اُن دنوں کی طرف لوٹ گئے جب بیٹے نے کہا تھا۔ بابوجی، میں بھی شاستریہ سنگیت میں آپ ایسا کمال پیدا کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈھیر سارا روپیہ کما کر۔ اور بابوجی نے بڑی شفقت سے بیٹے کے کندھے کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ایسے نہیں ہوتا، راجو... یا آدمی کمال حاصل کرتا ہے یا پیسے ہی بناتا چلا جاتا ہے۔ جب دو بڑے

بڑے آنسو لڑھک کر گاندھرو داس کی داڑھی میں اٹک گئے، جہاں دُروے بیٹھا تھا، اُدھر سے روشنی میں وہ پر نرم ہو گئے، سفید روشنی جن میں سے نکل کر سات رنگوں میں بکھر گئی...

دروے کو نہ جانے کیا ہوا۔ وہ اُٹھ کر زور سے چلایا ___ گیٹ آوٹ...

اور لوگ چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے ہوئے بھاگے۔

گاندھرو داس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور صرف اتنا کہا ___ نہیں بیٹے، نہیں۔

ان کے ہاتھ سے کوئی برقی رو سی نکل رہی تھی۔

دروے جب لارسن اینڈ لارسن میں گیا تو فلیپ، اس کا ورکس مینجر کمپیوٹر کو ڈیٹا فیڈ کر رہا تھا۔ کمپیوٹر سے کارڈ باہر آیا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپک رہا تھا اور کارڈ کی طرف دیکھ رہا تھا... لارسن اینڈ لارسن کو اکتالیس لاکھ کا گھاٹا پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں اُس نے کارڈ دُروے کے سامنے کر دیا، جسے دیکھ کر اُس کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ دُروے نے صرف اتنا کہا ___ کوئی انفارمیشن غلط فیڈ ہو گئی ہے۔

نہیں سر... میں نے بیسیوں بار چیک، کر اس چیک کر کے اسے فیڈ کیا ہے۔

تو پھر... مشین ہے۔ کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو گا۔ آئی۔ بی۔ ایم والوں کو بلاؤ۔

مودک ـــــ چیف انجینئر تو ساؤتھ گیا ہے۔

ساؤتھ کہاں؟

تُرو پتی کے مندر... سُنا ہے اُس نے اپنے بلبے، اپنی بال کٹوا کر مورتی کی نذر کر دیئے ہیں!

درُو نے ہلکا سا مسکرایا اور بولا ـــــ تم نے یہ انفارمیشن فیڈ کی ہے۔ کہ ہمارے بیچ ایک باپ چلا آیا ہے؟

فلپ نے سمجھا، دُروے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں، یا ویسے ہی اُن کا دماغ پھر گیا ہے۔ مگر دروے کہتا رہا ـــــ اب ہمارے سر پہ کسی کا ہاتھ ہے، ہتریک ہے اور اُس کے نتیجے کا حوصلہ اور ہمت... مت سمجھو، یہ مشین کسی انسان نے بنائی ہے، جس کا کوئی باپ تھا۔ پھر اُس کا باپ... اور آخر سب کا باپ ـــــ جہل مرکب یا مقدّر!

فلپ نے اپنی اندرونی خفگی کا منہ موڑ دیا ـــــ کیا دیویانی اب بھی بابو جی کے پاس آتی ہے۔

ہاں

مسز دُروے کچھ نہیں کہتیں؟

پہلے کہتی تھیں۔ اب وہ اُن کی پوجا کرتی ہیں۔ بابو جی دراصل عورت کی جات ہی سے پیار کرتے ہیں، فلپ .... معلوم ہوتا ہے انہوں نے کہیں

پرکمرتی کے چتون دیکھ لئے ہیں، جن کے جواب وہ مسکراتے تو ہیں، لیکن کبھی کبھی بیچ میں آنکھ بھی مار دیتے ہیں۔

فلپ کا غصہ اور بڑھ گیا۔

دُروے کہتا گیا ——— بابو جی کو سندیہ۔ بیٹی، بہو، بھابی، چاچی، للّی، میا بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ بہو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیار سے اس کے گال بھی چوم لیتے ہیں اور یوں قید میں آزادی پا لیتے ہیں اور آزادی میں قید ۔۔

دیویانی ؟

دروے نے حقارت سے کہا ——— تم سیکس کو اتنی ہی اہمیت دو، فلپ جتنی کا کہ وہ مستحق ہے۔ تیتر بٹیر بنے بغیر اسے حواس پہ مت چھانے دو۔۔۔ سنگیت شاید ایک آدھی دیویانی کے لئے ۔۔۔

میں سمجھا نہیں سر؟

بابو جی نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکی بچپن ہی میں آوارہ ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ کو کچھ اس عالم میں دیکھ لیا، جب کہ وہ نوخیزی سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ جب سے وہ ہمیشہ کے لئے آپ ہی اپنی ماں ہو گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ گھبرا کر ایک مرد سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے کے پاس جانے لگی۔ اس کا بدن ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، مگر روح تھی کہ تھکتی ہی نہ تھی۔

کیا مطلب ؟

دیویانی کو دراصل باپ ہی تلاش تھی۔

فلپ جو ایک کیتھولک تھا، ایک دم بھڑک اُٹھا۔ اس کے ابرو بالشت بھر اوپر اٹھ گئے اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے نارِ جہنم لپکنے لگی۔ اُس نے چلاّ کر کہا۔ یہ فراڈ ہے، مسٹر دُروے پیود، آن اڈلٹریٹیڈ فراڈ۔۔۔

جبھی دُروے نے اپنے خریدے ہوئے باپ کی نم آنکھوں کو درتے ہیں لئے، کمپیوٹر کے پسِ منظر میں کھڑے فلپ کی طرف دیکھا اور کہا —— آج ہی بابو جی نے کہا تھا! تم انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، صرف محسوس کرو اسے۔۔۔

لُولو

"لُولو"، انسپکٹر گپتے نے عاجز ہو کر کہا۔
اُس کی آواز اب ایک بازگشت ہو کر رہ گئی تھی، بلکہ بیٹھ لائی ۔
جب اُس نے ملزم سے پوچھا "کہ، کون تھا اس قتل کے پیچھے؟"
ملزم وقائی (وِنایک) بدستور خاموش تھا۔
گپتے اور اس کے ساتھی اجگاؤں کر وغیرہ نے ونائی پہ تیسری ڈگری کے سب گُر استعمال کئے تھے اور اب ڈر گئے تھے کہ کہیں مار کے نشان ملزم کے بدن پہ رہ گئے تو وہ خود دھر لئے جائیں گے۔ ریمانڈ کے چودہ دنوں میں سے صرف تین باقی تھے۔ جب کہ انہیں ونائی کو چارج شیٹ کے ساتھ میٹرو پالیٹن مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا تھا جو خود شکل ہی سے قاتل جرم معلوم

ہوتا تھا۔ قتل کے پیچھے سازش کا ثبوت فراہم کرنے کے سلسلے میں گیتے اور اچگاڈنکہ کی ہر تفتیش اندھی کالی راہوں سے ٹکراتی، خاک وخون اڑاتی، روتی چلاتی، وناتی ہی پہ لوٹ آتی تھی۔

پیلاچو کی کا یہ پولیس اسٹیشن راجدھانی کے معمار لیوفنٹ نے نہیں کسی مقامی ہونق نے بنایا تھا اور اس بات کا خیال رکھا تھا کہ کہیں ہوا کا رُخ حوالات کی طرف نہ ہو۔ فضا کی رطوبت اس کی سیلن کا باعث بنے۔ پھر اور باتیں ـــ تادیب، تھرڈ ڈگری وغیرہ۔ اب تک ان دیوارں پر مصیبت کے نقشے بن چکے تھے۔ انسان کے اندر کا ڈر باہر آکر دیواروں پر مصوّر ہو گیا تھا۔ ان تجریدی تصویروں کے سامنے چینی جاپانی ڈریگن، تبتی مہاکال، افریقی ہوڈو وغیرہ کچھ بھی نہ تھے۔ چھت پر جو شکلیں منترع ہوئی تھیں، انہیں دیکھ کر تو کوئی معصوم سے معصوم بھی چلّا اُٹھتا — گگو کو میں نے مارا ہے، محسن تو یہ کا قتل میں نے کیا ہے، تو بہ . . . .

کرسی جس پہ گیتے بیٹھا ہوا تھا، اُس کا ایک بازو غائب تھا اور جہاں اچگاڈنکہ براجمان تھے، اُس کے دونوں . . . وہ دونوں بازو، دایاں اور بایاں، یا تو ونائی پہ استعمال ہوتے تھے اور یا پھر ملکی سیاست میں حصّہ لینے چلے گئے تھے۔ اوپر ہزار واٹ کا ہنڈا اور ایسی کچھ اور چیزیں جمہور کی طرح نوحتیں۔

حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے جلس باہر جھانک رہا تھا جہاں ہال میں ڈپوٹی افسر تین چار غنڈوں کا بیان لے رہا تھا۔ وہ عادی مجرم ایک عجیب قسم کی بے نیازی سے بیٹھے، پورے انسانی جرم سے منکر ہو رہے تھے گویا وارداتیں انھوں نے نہیں ہمزادوں نے کی ہیں۔ ایک تو بار بار اپنا ہاتھ ران پہ مارتا تھا، جیسے پہلوان لوگ اکھاڑے میں اُترنے سے پہلے چیلنج کے انداز میں مارتے ہیں۔ کوئی ننگا ہو اور اپنی برہنگی کا احساس رکھے تو ہر آتا جاتا اسے دیکھتا ہے، لیکن اگر وہ اپنی اس صورت پر شرمائے نہ لجائے، اُلٹا ڈھٹائی سے دوسروں کو دیکھتا جائے تو سب کی نظر نیچی ہو جاتی ہے۔ کانسٹیبل، میٹروپالیٹن بمبئی کے نیلے بھوت، ہتھکڑی کے پس منظر میں بے کار، صرف حکم کے منتظر تھے۔ ان کا بس چلتا تو ہر شہری کے ہاتھوں میں وہ لوہے کے زیور پہنا دیتے۔ محرّر کا قلم جیسے ہر وقت خارش رہتی تھی۔ دوات میں ڈوب رہا تھا اور وہ خود بے کار بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا اور الیف۔ آئی۔ آر کا رجسٹر ان سب لوگوں کے کرم خوردہ مسوڑھوں اور جبڑوں کی طرح سے کھلا سامنے میز پہ پڑا تھا۔

باہر بارش ہو رہی تھی بے کار کی رِن مِن، رِن مِن، رِن مِن

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بغیر کسی وجہ، کسی سازش کے ونائی ایک خوبصورت نوجوان عورت کا قتل کر دے؟ ایسے رینو دھام کے گلے میں منگل سوتر، ناک

میں پھلی، بانہوں میں چوڑیاں جوں کی توں موجود تھیں۔ کاروننکی رپورٹ میں جبر تو ایک طرف کسی جھپٹ کا بھی اندراج نہ تھا۔ کوئی نئی یا پرانی دشمنی بھی ثابت نہ ہو سکی تھی، کیونکہ ایستے وڈالا کے نمک والے، بیرک نما کوارٹروں میں اپنے شوہر نارائن اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی، جب کہ ونائی اس سے فرسنگ پرے ــــ ورلی کے کولی واڑے میں، جہاں بوُبل مچھلی کی بو چوبیس گھنٹے انسان کے جسم و ذہن کا احاطہ کئے، اس کے پور پور میں بس جاتی... ونائی کی محبوبہ شکو وڈالے کے پاس رہتی تھی البتہ ــــ ایلٹوب پل کے نیچے، ہاربر برانچ کی ریلوے لائن کے بازو میں، جہاں بے شمار جھونپڑ پٹیاں برسات اور نرٹا کے میل جول سے جیسے اپنے آپ اُگ آتی تھیں مگر اس کا ایستے سے کیا تعلق؟

ایستے اور اُس کا میاں براہمن تھے، شکو اور اس کے ماں باپ کولی، جو ڈاکٹر امبیدکر کی شہ پہ بدھ ہو گئے تھے۔ اس پہ بھی نہایت ہی لاپزیر ہندو سماج انہیں عزت سے بلانے کی بجائے بدھو کہتا تھا۔ موقع پڑتے ہی ان کی جھونپڑیاں تک جلا ڈالتا۔ انہیں جسمانی اور روحانی عذاب پہنچاتا گویا بدھ ہو جاتے پر بھی یہ لوگ اچھوت کے اچھوت ہی رہے۔ حالانکہ تاریخ کے دھندلے ادوار میں انہی کولی، ماہی گیر لوگوں کی ایک حسینہ گگس گندھا نے پانڈوؤں کے باپ سے شادی کی تھی اور آج جن لوگوں کے

سامنے ہمیں سر جھکانا پڑتا ہے اُن کی ماں بنی تھی... پھر نارائن کا رقیب بھی نہ تھا کوئی۔ البتہ المزام ہی لگانا، قانون کو پڑانا ہو تو ہر آدمی اس کے مرد کا رقیب ہوتا ہے، جس کی عورت الیشے ہو!

الیشے معمول کی طرح گنپتی وسرجن کے لئے مرد عورتوں کے ساتھ بیوڑی والے ساگر کی طرف گئی تھی۔ بھوکے، ننگے لوگ... پیٹ میں پاپڑی نہیں تن پہ چیتھڑا نہیں، مگر جا رہے ہیں، ناچ اور گا رہے ہیں، چاہے سوکھا ہو چاہے برسات، وہ خود نہیں، بیوڑا انہیں گھسیٹے لیے جا رہا تھا شاید، اور یا پھر مذہبی جوش، جو بیچ میں جنون ہو ہو اٹھتا تھا۔ جب وہ کسی کی بھی بے عزتی کر دیتے۔ اندر کی کسی جلن سے کاروں کے شیشے توڑ دیتے اور کسی کی مجال نہ تھی انہیں کچھ کہنے کی۔ کیسے کہتے، کیونکہ پوری قوم، قومیت تھی ان کے پیچھے اور شیوسینا... جیسے محرم میں تعزیہ نکالنے والوں کے پیچھے پوری شیعہ قوم نہیں ہوتی؟ آٹھ بازوؤں والی دُرگا کے پیچھے بنگالی نہیں ہوتے چاہے وہ گھاس ہوں یا نکسل وادی؟ ایسے ہی جیسے بیوڑہ بنانے اور بیچنے والوں کے پیچھے پوری انڈر ورلڈ ہوتی ہے، مافیا ہوتا ہے۔ ایک معمولی سے ٹریفک کانسٹیبل کے پیچھے پوری سرکار ہوتی ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ونائک کے پیچھے صرف ونائک ہو؟

ایک بے آس، غیر مامون جذبے تلے گنپتی وسرجن والے مورتی لے

جاتے، ناچتے گاتے ہوئے جا رہے تھے ـــــ گنپتی بابا موریا، پُڑچے ورشی لوکرآ ـــــ یعنی کہ اگلے برس جلدی آ۔ مگر یہ پرارتھنا تو پچھلے اور اس سے پچھلے برس بھی کی تھی ان لوگوں نے۔ پھر سمپتی دینے والے گنپتی بابا نے کیا دیا تھا انہیں؟ کس کس کے گھر بھر دیئے تھے؟ اُلٹا ان کی لمبی سونڈ اور پھیلی ہوئی توند کو دیکھ کر یوں ہی معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سب کے حصّے کا وہ خود ہی کھا گیا ہے۔ ایرانی ہوٹل والے واشٹرپتی کی سفارش سے پاؤ دیتے تھے۔ شکر بازار سے یونہی غائب ہوگئی تھی۔ گھاسلیٹ کے لئے میل میل، ڈیڑھ ڈیڑھ میل کے کیتو لگتے تھے۔ اس کی نایابی کی وجہ سے گھروں میں چولے جلنے بند ہوگئے تھے۔ کوئی زمانہ تھا کہ عورت سونے کی کوئی چیز یا اچھی سی ساڑھی دیئے جانے پر اپنا سب کچھ دے بیٹھتی تھی، لیکن اب صرف گھاسلیٹ کے چھوٹے سے ٹین پر اُترآ آئی تھی۔ . .

گنپتی بابا موریا، کے ورد سے یہ تھک جاتے تو کسی زٹل قافیہ پہ چلے آتے، جو پوری زندگی ہوگیا تھا۔ دودھ والے ہوٹل کی ملائی مار گئی! اور پھر "مارہ گئی"، کی مناسبت سے وہ اس کی بے شمار گندی گردانیں کرتے ہوئے چلتے بھیگی ہوئی چھوکریوں کے نمایاں کچھواڑوں پر چٹکیاں لیتے، اپنے اور اُن کے اگاڑے منتقل کرتے... ایشٹی بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس کا بدن جو ایک ہی مرد کے مسلسل مماس سے سوگیا تھا، جاگ جاگ اُٹھتا۔ اُسے

گمان بھی نہ تھا کہ ٹرچے ورشنی تو ایک طرف، پڑ چے پل ہی میں ونائی کا رامپوری چاقو اس کے آر پار ہوگا۔۔۔ یہ انوکھا جماس اسے کہاں سے کہاں پہنچا دے گا اور اس عزیب کا اپنا وسرجن پانی کی بجائے آگ میں ہوگا۔ ساگھ کا بڑا اونل کتنا ہے۔۔۔ آگ پانی سے بھی بڑی ہے، کیا معلوم؟

بائیس چوبیس کی ہوگی ایشے۔ یعنی اس عمر کی جس میں ہر عورت اپنے وجود ہی سے کھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔۔۔ بس ہوں مغربی گھاٹ کی پیداوار ہونے کی وجہ سے سب ناریل، اور ان میں کا سارا کھوپرا اس کے بدن کو بنانے میں گیا تھا۔ پھر کیا کیا گولائیاں، بالائیاں چلی آتی تھیں اس پر۔ اُوپر کچھ ولندیزیوں، عربوں کا خون مِل گیا تھا، جو بھارت کے پچھمی ساحل پہ تجارت کرنے کے لئے آتے تھے۔ ان کے کارن نہ صرف ایشے کا رنگ سرخ و سپید تھا، جلد ریشمیں، بلکہ آنکھیں بھی عرب ساگر کی طرح سے زمردیں ہو گئی تھیں۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جب نارائن کو اس کی لاش ملی تو وہ اسے اپنے نمک والے گوداموں میں لے آیا۔ سب تماشائیوں کو نکال کر اس نے ایشے کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور قریب ڈیڑھ دو گھنٹے اُس کے ساتھ اکیلا رہا۔ جب دروازہ کھُلا تو لوگوں نے دیکھا ایشے دلہنا پے کا کانٹا لگائے پڑی ہے۔ اس کی ناک میں پھُلی کی بجائے کھرا ہے، پاؤں کی انگلیوں میں بچھوا....

کتنا پیار کرتا تھا نارائن اس سے۔ شادی کے بعد ایک بار ایشے جب مائیکے گئی تو کسی نے پوچھا۔۔۔ کے دن رہ گئے بہو کے آنے میں؟ نارائن نے فوراً جواب دیا۔۔۔ بیس دن اور اکیس راتیں؟

جب نارائن مسکرا بھی نہ رہا تھا۔۔۔۔

اب ایشے کی ارتھی نکلی تو وہ رو بھی نہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو کہاں چلے گئے تھے، یہ میں پھر بتاؤں گا۔ ابھی اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سب اڑوس پڑوس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اپنے سُرخ کاٹنے کفن میں اپنے اور بھی گوری جیّ لگ رہی تھی۔ وہ ایک ایسی نیند سو رہی تھی، جو شب زفاف، میں دلہن چار پہر بار نکل جانے کے بعد سوتی ہے۔

ارتھی اُٹھ جانے کے بعد اس کے بچے۔۔۔۔ نانھو اور سلیھا بار بار پوچھتے تھے۔۔۔۔

"آئی کُٹھے؟" (ماں کہاں ہے؟) اور ایک راشٹر بھاشی جواب دیتا، آئی تو گئی۔۔۔ ایسی معمولی سی ترکیب و صنع کرنے سے اس کی لسانی مہنوت تکمیل کو پہنچ جاتی۔

صرف دو دن رہ گئے تھے ریمانڈ میں، جب کہ انسپکٹر گھنٹے نے ونائی پر تفتیش کا آخری تھپڑ مارا۔ ونائی اپنی جگہ سے ہل گیا۔ اُس کے ہونٹ تھوڑا بھینچ کر فوراً ہی معمول کے ہو گئے۔ ایک ٹھنڈے غصّے میں جانے وہ کیا کچھ پی گیا۔

گرم غصّے میں آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور شریانوں کی گانٹھیں اُن میں سُرخ دھبے۔ خون کا دباؤ ایکا ایکی بڑھ جانے سے تنفس گھوڑچال ہو جاتا ہے۔ نتھنے پھولنے لگتے ہیں، ہونٹوں پر کف چلی آتی ہے، بدن کی رگیں اور پٹھے تن جاتے ہیں، کوئی اور ممکن وار اپنے اوپر لینے کے لئے۔ مگر وہ ——— ونائی، رنگ کا کالا۔ بدن کا کھُردرا، جات کا کھولی، جیسے گوشت پوست سے نہیں کسی عقیدے کی فولاد سے بنا تھا جسمانی یا روحانی مار کا اس پہ کوئی اثر ہی نہ تھا۔ اس سارے سلسلے میں یا تو وہ آگے کی بہت سی صدیاں گن گیا تھا اور یا پیچھے کی۔ وہ دلت پنیتھروں کے ساتھ فلرٹ کرتا تھا اور کبھی کبھی شیو سینا کے رسالے 'مارمک' میں کسی دوسرے نام سے لکھتا بھی تھا۔ اس وقت وہ تخفیف کے انداز میں کھڑا تھا، جیسے کوئی بھگت سنگھ دیس کی آزادی کے لئے پھانسی لگنے جا رہا ہو۔ اُلٹا اس کی آنکھیں کچھ اور سپیدی پکڑ گئی تھیں، کفن کی تہوں میں لپٹی ہوئی نیلاہٹ چلی آتی تھی ان میں، جن میں ساگر ڈوب رہے تھے، اپنے اندر پوری لوکائی کا دسر جن لئے ہوئے اس کا غصہ، اوپر، اور اوپر، لاشعور کی تہوں میں جا چھُپا تھا، جہاں ساری خدائی ملتی ہے اور وہ ——— غصہ، کسی ایک فرد کا ہو کر رہ جانے کی بجائے پورے اجتماع کا ہو جاتا ہے...

تب، وہاں، اوپر لاوجود نشستوں میں کیا کیا بے نُطق فیصلے ہوتے ہیں، جن سے خدا بھی ڈر کر انصاف کی کُرسی چھوڑ دیتا ہے اور ڈرتا کانپتا ہوا

سینچے اگر کسی اپنے خدا کے سامنے دستِ بدُعا ہو جاتا ہے۔

باہر آج بارش ہو رہی تھی اور انسان کے نفس، اس کی سانس کا بیڑہ غرق کر رہی تھی۔ کہاں تو پورے جولائی اور اگست کے مہینے خالی گئے تھے اور کہاں اب، ستمبر کے آخر میں یوں لگ رہا تھا، جیسے ورن بیئر کے کیگ کے کِگ بی کے دُنیا کو اپنے چھوٹی حاجت کا شکار بنا رہا ہے۔ خریف کی فصل تباہ ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا فارسی زبان نہ جاننے کی وجہ سے ربیع اور خریف کے معنی نہ سمجھتا تھا۔ فصلوں میں اسے کوئی تمیز نہ رہی تھی وہ تھوڑا امیر ہو، تھوڑی سنسکرت اور عربی بس شُدبُد رکھتا تھا اور بس۔ معلوم ہوتا تھا اُسے ایک ہی زبان آتی ہے، جس کا نام ہے ۔۔۔ آہ!

جب سرکار کے میٹ ڈیپارٹمنٹ کے لوگ، خدا کے نمائندے بنتے، ایک بلیٹن شائع کر دیتے ۔۔۔ خلیج بنگال میں ایک طرف، ایک کونڈا پیدا ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ٹانی فون بن کر اڑیسہ کے بے شمار گاؤں کو تباہ کرتا ہوا دمن کٹیل کے ضلع کی طرف نکل جائے (جہاں کھاد کا کارخانہ ہے) اور یا پھر مدھیہ پردیش سے مراٹھ واڑ، بمبئی کی طرف چلا آتے۔ کچھ علاقوں کو تو وہ باڑھ سے برباد کر گیا اور کنیتوں میں سوکھا ہو گیا ۔۔۔ اور لوگوں کو اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے چھوڑ گیا کہ ان کے لئے بھو کا مرنا اچھا ہو گا یا ڈوب کے جان دینا؟ چاروں طرف ہا ہو مُو کا نقارہ بج رہا تھا۔ بے زبان،

بے سُرا بے تال۔۔۔

اور ونائی چپ تھا۔ جب صابر جابر کے سامنے تن جاتے تو بڑے بڑوں کی گاف بند ہوجاتی ہے۔ سازش کی تفتیش کے سلسلے میں گپتے اتنا تنگ آ گیا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ پیٹی اور پتلون اُتار کر ونائی کے سامنے لیٹ جائے۔۔۔ اسے ریمانڈ کے پہلے چند دن یاد آرہے تھے، جب اُس نے ونائی سے پوچھا تھا۔۔۔۔

"تم نے ایشتے کو کیوں مارا؟"

ونائی نے یونہی سر ہلا دیا جس کا مطلب تھا۔۔۔ ایسے ہی۔

"اس لئے کہ وہ اونچی جات والی تھی؟"

"نہیں"

"امیر عورت تھی؟"

"نہیں"

"خوب صورت اور جوان تھی؟"

"نہیں، نہیں، نہیں" ونائی نے قدرے برافروختگی سے کہا "شکو اس سے کہیں زیادہ سُندر، کہیں زیادہ جوان ہے"

"شکو؟" گپتے نے اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا

"وہ کالی کلوٹی، کولی چھوکری، جو آٹھ آٹھ آنے میں۔۔۔"

اس سے پہلے کہ گپتے اپنی بات پوری کرتا، وناتی ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا ـــــ "باسٹرڈ!... تمہاری بہن سے اس کا ریٹ زیادہ ہے۔"

یہ وہ وقت تھا، جب کہ گپتے نے وناتی کو پہلا اور بھرپور تھپڑ مارا۔ اس کی انگلیاں اس نوعمر مگر سرکش لڑکے کے گالوں میں کھُب گئیں۔ وہ ہل نہ سکتا تھا، کیونکہ حولدار اور کانسٹیبل لوگ مضبوطی سے اُسے پکڑے ہوتے تھے۔ وناتی پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، نہ ہی انگلیوں کے نشان آتے۔ آخر کالے رنگ پر نیلا کتنا دکھائی دیتا ہے؟

گپتے نے اپنے سینئر اچگاؤنکر کی طرف دیکھا۔ وناتی بولتا چلا گیا ـــــ "دنیا کے تائنٹی نائین پرسنٹ لوگ اگر ایک ٹکے میں بکتے ہیں تو آپ لوگ آدھے میں... وہ سب دلت جاتی کے ہیں ـــ رنگ کے کالے، پر صحت والے۔"

اور وناتی نے دایاں بازو دُہرا کر کے بائیں سے اپنے باقی بیپ چھوتے اور اکڑ کر بولا

"تم سب کی مائیں بہنیں اس کا زور دیکھنا مانگتی ہیں۔"

تبھی گپتے نے کرسی کا بازو کھینچا اور پے در پے وناتی پر برسانا، اُسے گالیاں دینا شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد وناتی لڑکھڑایا اور پھر ان سب کے سامنے ڈھیر ہو گیا اور یوں تفتیش کا پہلا سیشن ختم ہوا۔

رات مرہم پٹی ہو جانے کی وجہ سے وناتی ہوش میں آچکا تھا، پوری

رات وہ سیلے فرش پر پڑا رہا کپڑے پھٹ جانے کی وجہ سے وہ کچھ ڈھکا، کچھ ننگا، مغربی گھاٹ کا کوڑیالا کو برا معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے فرش پر رات کی وہ سوکھی روٹیاں پڑی تھیں جو اب تک پاپڑ ہو گئی تھیں۔ دال کی کٹوری میں سمار وغ قسم کی ایک سفید سی جھلی چلی آئی تھی۔ چاول چیونٹے لے گئے تھے۔ اور جب وہ ختم ہو گئے تو ونائی کو کاٹنے لگے، چیونٹوں نے جب دیکھا کہ اُسے کاٹنے سے خود مرنے لگے ہیں تو وہ بھاگ کر چلینو ٹیالہ میں دبک گئے۔

انسپکٹر لوگ آئے۔ اُن کے چہروں کی رگیں اور پٹھے کچھ ارادوں سے تنے ہوئے تھے ــــــ

« ونائی »، اجگاؤنکر نے پکارا

ونائی اُٹھا، گرا، پھر اُٹھا اور اپنا کو برتی بھی تان کر اجگاؤنکر کو دُرست کرنے لگا ــــــ « ونایک راؤ... ونایک راؤ... »

« اوکے ... اوکے »، اجگاؤنکر نے اپنے بید کو بغل میں اڑستے ہوئے کہا « مسٹر ونایک راؤ... »

" THAT'S RISHT " ونائی نے کہا۔ اس کے چہرے پر اب نفرت کا ایک احساس تھا۔ بازو کے ایک جھٹکے سے اس نے کہ دن پر لگا ہوا رات کا پسینہ اور میل پونچھا اور اجگاؤنکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ــــــ

اجگاؤنکر نے پوچھا ـــــ "تم ہوٹل نیرج کے پروپرائٹر کو جانتے ہو؟"

"نہیں"، ونائی نے جواب دیا، "ہاں ایک بار کھانا کھانے آیا تھا اُدھر۔"

"تم جانتے ہو، جوزف پریرا، اس کا پروپرائٹر، ٹاؤن کونسلر کلکرنی اور وڈالے کے کچھ بنیئوں کے ساتھ مل کر گانجا اور فیمنی بیچتا ہے؟ گوا سے مبیرہ منگواتا ہے، فارن سے سکاچ؟"

"یہ میں نہیں جانتا ـــــ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں، کہ اس کا دھندا تم مادر ـــــ کو ہفتہ کھلائے بغیر دو دن بھی نہیں چل سکتا..."

اجگاؤنکر تلملا کر رہ گیا۔ بات سچی تھی مگر یوں دو ٹوک تو کمشنر نے بھی نہیں کی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے ماتھے پر کا پسینہ پونچھا اور پھر گپتے کی طرف اشارہ کیا کیونکہ یہ کیس دراصل اس کا یعنی گپتے کا ہی تھا۔ یہ ایسے ہی تھا، جیسے کورٹ میں استغاثہ جب اپنی جرح ختم کر لیتا ہے تو وکیل صفائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ـــــ

"یور کیس...."

گپتے نے کہا "راؤ صاحب... آپ کے نالج میں ہے، جوزف پریرا ایسٹ پر آنکھ رکھتا تھا؟"

"آنکھ رکھتا تھا کہ ٹانگ رکھتا تھا..." ونائی نے جواب دیا

"کون، کیسے کیسے دھکے لگاتا ہے، میں کیا اس کا اکاؤنٹ رکھتا ہوں؟"

"نہیں پتہ ہے پریرا اور علاقے کے دادا اکرم نے وادر اور پریل کے کراس روڈ پہ جہاں مہابیر کا مندر ہے، ایسنے کو چھاتی سے پکڑ لیا تھا۔

"ہوں"

"پھر شور مچ جانے سے پریرا بھاگ گیا، مگر اکرم پکڑا گیا۔ لوگوں نے اسے مارا؟"

ونائی نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "اس لئے مارا کہ سالوں میں خود ہمت نہیں تھی چھاتیاں پکڑنے کی۔"

ونائی ہنس رہا تھا!

"اس سے پریرا کی بے عزتی ہوتی،" گینتے نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کا دھندا چوپٹ ہو گیا؟"

"تب؟"

"گینتے نے آواز کو بلند کیا تب، بدلہ لینے کے لئے اس نے ایک اجیر، ایک ہائیرلنگ رکھا؟"

"ہوں"

"اور وہ — تُم تھے... تُم... تُم..."

اس سے پہلے کہ ونائی جواب دیتا، اجگاؤنکر نے گویا چھت پھاڑ دی۔

"کے روپوں میں فیصلہ ہوا؟.... بولو...."

"بولو"، گپتے اس کے ساتھ ہی گرجا۔

ونائی خاموش رہا۔ انسان ہمیشہ اس لئے خاموش نہیں رہتا کہ وہ مجرم ہے۔ وہ تھک بھی جاتا ہے۔

یہ وہ وقت تھا، جب آدمی اس قدر بھائیں بھائیں کرتی ہوئی خاموشی کے سامنے نہ صرف بے بس ہو جاتا ہے، بلکہ کانپنے لگے۔ نامردی میں، غصے میں۔ جبھی دوسری کرسی کے بازو ونائی پر ٹوٹ ٹوٹ گئے وہ پھر بے ہوش گیا اب وہ مفتوح فاتح تھا۔ اس کی ناک ہی سے نہیں، کان سے بھی خون بہنے لگا تھا، جو دماغ سے جریان کی علامت ہے۔ گپتے اور اجگاؤنکر دونوں کی چھٹی ہو گئی ....

"ڈھوکے"، گپتے نے گھبرائی ہوئی آواز میں حوالدار سے کہا، "بھاگو... ناکے پر جاؤ اور برف لاؤ۔"

حوالدار ڈھوکے نے "ہو" کہا اور سیلوٹ کے تکلف میں پڑے بغیر باہر کی طرف لپکا۔ پیچھے سے گپتے نے تاکیدی آواز دی "پوری سل لانا"

دو روز بعد تیسرا سیشن ہوا۔ ونائی بچ گیا، جب کہ گپتے، اجگاؤنکر اور کچھ کانسٹیبل مل کر ونائی کے پھسل کر گرنے اور زخمی ہو جانے کا پنچ نامہ تیار کرنے کی فکر میں تھے۔ تیسرے دن ڈاکٹر آئی۔ آئی۔ گلاٹی کی مدد سے انہوں نے ونائی کی زبردستی فیڈنگ کی۔ طاقت کے انجکشن دیئے تاکہ اُسے تندرست

بتائیں اور پھر ماریں۔

یہ دیکھ کر کہ اس وقت اذیّت ٹھیک نہیں ہے، گپتے اور اجگاؤنکر نے پینترا بدلا۔ ونائی کے پاس آتے ہوئے اجگاؤنکر نے کہا

"ونے"

ونائی چوکنّا ہو گیا۔ کسی نئی حرام زدگی کے لئے تیار۔

"تم میرے بھائی ہو نہ"

"ہوں"

"تمہارا گاؤں اڑوت اجگاؤں ہی کے پاس ہے"

"ہوں"

اس سے پہلے کہ اجگاؤنکر اپنا ہاتھ کسی مصنوعی میلان سے ونائی کے کندھے پہ رکھتا، ونائی نے پوری قوت سے یوں جھٹک دیا کہ وہ اجگاؤنکر کی پیٹھ سے جا لگا اور اسے موچ سی آتی محسوس ہوئی۔ گپتے، حولدار ڈھوکے اور دوسرے کانسٹیبل حیران تھے کہ اتنا سب کچھ ہو جانے، پہروں بھوکا رہنے کے باوجود اُس چھوکرے میں اتنی طاقت کہاں سے چلی آئی ہے؟

"میں تمہاری مار سہہ سکتا ہوں" ونائی بولا "پیار نہیں"

صاف دکھائی دیتا تھا کہ ونائی کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ رہے ہیں اور کتنی محنت، کتنی مشقت سے وہ انہیں کہیں اُوپر بھیج رہا ہے۔ مگر چونکہ آنسو اور جذبہ

ہم زُلف ہوتے ہیں، اس نے کسی رشتے کا لحاظ کیے بغیر کہا ۔ میں نے جو بولا ہے ، سچ بولا ہے ۔"

" سچ کہتے ہو" گپتے نے نرمی سے کہا۔

" اس گھات کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ نہیں ؟"

" نہیں"

اور پھر ونائی اپنے آپ شروع ہوگیا، جیسے کوئی صفائی یا تزکیہ چاہتا ہو۔

" میں اسے جاتی ، مت بھید کے لئے مارتا تو بدلہ لینے کی بات ہوتی ، پیسے کے لئے مارتا تو چوری بیری ، لوٹ مار کی ۔ شریر کے لئے مارتا تو ریپ کی"

" ہوں ... ہوں ..." گپتے اور اجگا و کھستے ایک ساتھ کہا اور ٹولی کے بیان آگے سرکا لیں۔ وہ یک لڑکی الفاظ صرف ونائی ہی کا ٹھیکہ نہ تھے ۔

" میں نے اپنٹے کو اس لئے مارا" ونائی نے گرمجوشی سے کہا۔

" گپنتی و سرجن کے پورے کہ اوڈ میں وہی تھی ، جس نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ جو بہت خوبصورت لگ رہی تھی اور انوسینٹ ...."

پھر تھوڑی دیر کے لئے وہ رُک گیا ۔ جیسے وہ رکا تھا، ویسے ہی شروع بھی ہو گیا ۔

" میں کسی ایسے کو قتل کرنا چاہتا تھا، جو ایک دم معصوم ہو، دیوی ہو، دیوتا ہو"

گُگتے اور اجگاؤ نکہ کے چہروں پر ابتری پھیل گئی۔ اب جو انہوں نے کہا وہ الفاظ کی مُشت زنی تھی ــــ "تمہیں پتہ تھا، ایشے کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں نا تھوُر اور شُلبھا۔۔۔"

"اور صرف ایک پتنی ۔۔۔۔" وناتی نے جیسے پورے عمرانی نظام پہ چوٹ کی۔ کچھ دیر خاموشی حکومت کرتی رہی۔

"تم دلت پنتھر ہو؟ ۔۔۔" آخر اجگاؤ نکہ نے سکوت کو توڑا، قانون شکنی کی۔

وناتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوال کو جواب کے قابل نہ سمجھتا تھا۔

"کرانتی کار؟" گُگتے نے تضحیک کے انداز میں کہا۔

"بلیک پنتھر؟ چے گیوارا کے پیرو؟ الفتح۔۔۔"

"میں ان سب کا باپ ہوں" وناتی نے ایک دم ایکسائیٹ ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے ایک بے قصور کو مارا ہے" اور پھر اسی دم بولا۔

"اُن کا باپ اور تمہارا پٹھنا (داماد)"

گُپتے اُچھل گیا، مگر اجگاؤ نکہ نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے دبا دیا اور بولا۔

"جانتے ہو تمہارے جُرم کی سزا موت ہے؟"

وناتی نے سر ہلایا ــــ "اسی لئے تو یہ سب میں نے کیا ہے۔۔ تم مجھے مارنا چاہتے ہو، اور میں مرنا چاہتا ہوں۔ بولو، جیت دونوں میں سے کس کی

ہوئی... ؟ بکواس یہ ہے کہ اب تم میرے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی مارنا چاہتے ہو، جیسے ایک آدمی کو مارنے سے تمہارے قانون کی کھُجلی دور نہیں ہو گی؟"

اور یہاں سے ونائی کا ٹھنڈا غصہ ایک واضح شکل اختیار کر گیا، کیونکہ اس کا چہرہ بے رنگ تھا کسی قسم کے تاثر سے عاری، جب کہ گیستے نے یکسوئی اور نادانی میں ایک نہایت مضحکہ بات کی" مر وگے تو پتہ چلے گا مرنا کیا ہوتا ہے!"

" WHAT A DONKY " ونائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

گُیتے اوراجگا ؤنجہ نے اوپر سے ہزار واٹ کے ہنڈے کی روشنی ونائی پر پھینکنا شروع کر دی۔ اور بھی بہت سی چیزیں تھیں پُوچھنے کی خاطر کے لیے۔ مگر اس وقت انہوں نے ایک ڈنڈے پر مرچیں لگا کر اسے ملزم کی مقعد میں ٹھونس دیا تھا۔

دُنیا کے کسی نہ کسی حصے پہ ہر سال، ہر وقت برف پڑتی ہے۔ ابھی وہ پگھل بھی نہیں پاتی کہ اس پہ اور برف پڑ جاتی ہے اور وقت کو منجمد اور فوسل بنا دیتی ہے۔

ونائی کی دُنیا کا نقطہ انجماد اسی دن سے بسیط ہونا شروع ہو گیا تھا، جب اس کا باپ ـــــ رتنا کولی، ریڈ سگنل کے باوجود اپنی ناؤ کے کہ سمندر

یں ٹہل گیا۔ اُس شام چاندا ور نیلپچون نے جانے کیا سازشش کی کہ دونوں نے مل کر رتنا کو اپنے آغوش میں کھینچ لیا۔ وہی مچھلیاں جنہیں رتنا کولی کھانا، پکانا اور بیچنا چاہتا تھا، مل کر اسے ہی کھا پکا اور بیچ گیئں۔ ماں ایک سپیرے کے ساتھ بھاگ گئی اور کچھ برسوں کے بعد ونائی کے لئے تین بہنیں اور دو بھائی لے کر لوٹ آئی۔ ونائی سکالرشپ آرفینج میں پڑھا، جو نام ہی کا آرفینج ــــ اناتھ آلیہ ہے، مگر اس میں صرف ناتھ ہی پڑھ سکتے ہیں۔ ونائی اگر وہاں پڑھا تو یہ فادر کرخابنس کی مہربانی تھی۔

وہ نقطہ اسی سال سمٹنا شروع ہو گیا۔ جب کہ لوگوں نے گنپتی کی مورتی گھر میں استھاپت کی اور پھل پھول اس کی سیوا میں بھینٹ کرنے لگے۔ اس دن ونائی اینٹوپ ہل کے دامن میں شکوُ سے آخری بار ملا۔

شکوُ ہاتھ میں گولڈ فلیک کا ایک پُرانا ٹین تھامے کھڑی تھی اور بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس کی زُلفیں وہم کی طرح سے لمبی، آنکھیں گمان کی طرح سے دھندلی اور بدن یقین کی طرح سے سخت تھا۔ گویا اینٹوپ ہل کے اِدھر آبنوس سے بنی ایک اپسرا تھی اور اُدھر فولاد سے بنی ہوئی اپسرا ــــ ٹوسے کا ری ایجرٹ ــــ یہ میں ری ایجرٹ کی مناسبت سے کہہ رہا ہوں کہ شکوُ کا بدن ایک بریتیا تھا، جس کی کنی کنی یورینیم تھی اور نس نس کوبالٹ۔ وہ معدنیات کی ایک کان تھی۔ جسے کسی نے ابھی تک پراسپیکٹ نہیں کیا تھا

وہ دھاتوں کا خزانہ، اسے ایک ہی دھات چاہیئے تھی اور وہ بھی صرف ونائی سے .... اسے نشچے ہوگیا تھا کہ یہی وہ مرد ہے جس کی وجہ سے اپنا آپ گم پڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جب ننکو نے بتایا کہ وہ اور اس کے ماں باپ رات سے بھوکے ہیں۔ گھاسلیٹ کے نہ ہونے سے چولہا نہیں جلا تو ونائی نے اپنے اُسی یک رکنی انداز سے کہا ــــ

"ہوُں"

"ہوُں کیا؟" ننکو نے ادا سے پوچھا، جس کے جواب میں ونائی نے پھر وہی "ہوُں" دہرادی، جو آواز پہلی "ہوُں" سے مدہم تھی، کیونکہ وہ سمجھ سے تعلق رکھتی تھی۔ یا پھر وہ کسی اَن جانے پھندے سے نکل کر آیا تھا۔

جبھی اسے قدوائی روڈ پہ ماٹنگا سائین کی طرف جاتا ہوا ایسو کمپنی کا ایک ٹینکر دکھائی دیا، جس پہ گھاسلیٹ تھا۔ پیچھے اس کی ٹوٹنی سے مٹی کا تیل قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

ونائی نے ننکو کے ہاتھ سے گولڈ فلیک کا ٹین جھپٹ لیا اور ٹینکر کے پیچھے دوڑا۔ سامنے ایک ٹرک کے آہستہ ہو جانے سے ٹینکر کی رفتار بھی کم ہوگئی تھی۔ ونائی اُچک کر اُس کے پیچھے لٹک گیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے سیڑھی تھامی اور دوسرے سے ٹین کو ٹوٹنی کے نیچے کر دیا۔ وہ چاہتا تو پھر کی

گھما کر ایک ہی سیکنڈ میں وہ چھوٹا سا ٹین بھر لیتا مگر اس نے سوچا وہ صرف وہی تیل لے گا جو گر کر سڑک پہ ضائع ہو رہا ہے۔۔۔

شکو، کلیجے پہ ہاتھ رکھے کھڑی دُور سے اُسے دیکھ رہی تھی۔

سگنل موافق نہ ہونے سے ٹینکر تھوڑا نا کے پہ رُکا اور پھر جھٹکے کے ساتھ دائیں طرف مُڑ کر سائین مانٹگا روڈ پہ ہو لیا۔ ریل کا پُل پار کرتے ہی وناتی کا ٹین بھرنے لگا۔ جبھی راشن کی ایک دکان پہ گھاسلیٹ کے لئے لمبے کیتو میں لگے ہوئے لوگوں نے دیکھا اور شور مچا دیا ــــ چور، چور۔۔۔۔

وناتی کا ہاتھ سلپ ہو گیا اور وہ نیچے سڑک پہ گر گیا۔ ٹینکر رُکا۔ لوگ لپکے اور وناتی کو پکڑ کر اسے مارنا شروع کر دیا۔ ٹینکر کا ڈرائیور اور اس کا کنڈیکٹر ساتھی اسے گھسیٹتے ہوئے پاس ہی کے پولیس اسٹیشن کی طرف لے جانے لگے۔ وناتی کو صرف ایک ہی چوٹ آئی تھی اور وہ یہ کہ ٹین کے ساتھ گھاسلیٹ بھی نیچے گر گیا تھا۔

وناتی نے نہیں مگر جانے کس نے شکو کا نام لے دیا۔ اس دن بہت گرمی تھی کیونکہ بادل تنے تھے، مگر چھینٹا نہیں پڑ رہا تھا۔ جبھی پولیس کا ایک آفیسر جیپ لئے انیٹو پ ہل کی جھونپڑ پٹی میں پہنچ گیا ــــ تفتیش کے لئے۔ اس نے شکو اور اس کے ماں باپ کو بتایا کہ وناتی حوالات میں ہے۔ اس پر چوری، ڈاکے ــــ ہاتی و سے لا یہ ی ما کے دوش لگے ہیں۔ شکو ایک تو پہلے ہی

بھوُکی تھی، اس پہ دناتی کے پکڑے جانے کی بات سُن کر وہ کانپنے لگی۔
"اسے مارا تو نہیں ؟" وہ بولی۔

آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے پیاس لگی تھی۔ اس کی وجہ گرمی تھی یا شکوُ، یہ نہیں معلوم۔ لیکن جیب شکوُ نے گھڑے سے پانی نکال کر اُسے دیا تو اس نے لیتے، پینے سے انکار کر دیا۔ شکوُ نے سوچا، کوئی بات نہیں۔ اونچی جات کا ہوگا۔ آفیسر نے بتایا دناتی باہر آسکے گا جب کوئی اس کا ضامن بنے گا۔

شکوُ نے چھاتی پہ ہاتھ رکھا اور بولی "ضامن میں بنوں گی۔"

"تم ؟" شکوُ کے باپ نے کہا۔

"تمہارے ...؟"

جب تک شکوُ غلیل کے گلے کی طرح سے باہر چھوٹ گئی تھی۔ آفیسر اُٹھا اور شکوُ کے باپ کو دلاسا دیتے ہوئے بولا "گھبراؤ نہیں کا کا شخص ـــــ پرسنل ضمانت بھی ہو سکتی ہے۔"

اور وہ باہر کھڑی جیپ کی طرف چل دیا۔

بوڑھے نے دتسلا، شکوُ کی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ٹنک تھے، مگر دتسلا باتی بولی "کوئی بات نہیں، جامنی نہ ہوتی تو آجاتے گی شکوُ..."

ونائی حوالات کی سلاخوں کے پیچھے سے ڈیوٹی آفیسر کو دیکھ کر چلا رہا تھا
"میں نے کوئی چوری نہیں کی، انسپکٹر... کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا... ٹھیکہ سے گھا سلیٹ لیک کر رہا تھا، سڑک پر گر کر ویسٹ ہو رہا تھا..."

پولیس آفیسر کی جیپ پہلے آگئی، جس سے اُتر کر وہ پولیس اسٹیشن کے پیچھے چلا گیا۔ جہاں راستہ کوارٹروں کی طرف جاتا تھا۔ ونائی نے شکو کو دور سے آتے دیکھا۔ وہ بھاگ رہی تھی اور اس کی گھنگھور زلفیں پیچھے کی طرف اڑ رہی تھیں، کہیں برستے جا رہی تھیں۔ اگلے ہی پل میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

آدھ پون گھنٹے کے بعد ایک کانسٹیبل نے حوالات کا دروازہ کھولا اور کہا
——"ونائیک راؤ... باہر"

ونائی جو اس ارتقا کے لئے تیار ہی نہ تھا، بولا "کیا مطلب؟... کیوں؟ کیسے...؟"

باہر آیا تو اس نے شکو بائی کو ڈیوٹی روم میں نہ پایا۔
"میری ضمانت کس نے دی ہے؟... کس نے بیل آوٹ کیا ہے مجھے؟"
اس نے ڈیوٹی آفیسر سے پوچھا، جس نے باہر کی طرف اشارہ کیا——
ونائی نے دیکھا شکو پولیس اسٹیشن کے احاطے سے باہر جا رہی ہے اور وہ اپنی نہیں، کسی اور ہی کی چال چل رہی ہے....

اس سے پہلے کہ وہ باہر لپکتا، ڈیوٹی آفیسر نے اُسے روکا اور ایک کاغذ سامنے رکھتے ہوئے کہا ــــ" جیسی کہو ۔۔۔ ہر اکتوبر کو باندرہ کورٹ میں حاجر ہونا مانگتا، سمجھا ۔۔۔ ؟ "

ونائی نے جلدی سے کاغذ پر دستخط کئے اور اس کی نقل ہاتھ میں چُر مُر کی اور پھر باہر کی طرف بھاگا۔ سڑک سے اِدھر ٹریفک سگنل کے سامنے ہی ونائی نے شکو کو آ لیا۔

" شکو "، ونائی نے کہا۔

شکو کچھ نہ بولی۔ وہ رو رہی تھی اور نہ ہنس رہی تھی۔ وہ اس عالم میں تھی۔ جس میں انسان دیکھتا ایک چیز ہے اور سوچتا دوسری۔ اور سوال کرنے والے کی طرف مُڑ کر صرف اتنا سا کہتا ہے ــــ ایں؟

ونائی نے شکو کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔" کیا ہوا شکو؟"

" کچھ نہیں،" شکو نے جواب دیا۔

ونائی اس کے پیچھے ہو لیا اور کچھ نہیں تو ٹریفک سے اسے بچانے کے لئے! سگنل کے پاس پہنچ کر ایک بار ونائی نے مُڑ کر پیچھے پولیس اسٹیشن کی طرف دیکھا، جس کی دیواریں ٹھوس کنکریٹ سے بنی تھیں۔

سگنل کے دوسری طرف سڑک پر کی ٹریفک ابھی راستہ نہ دے رہی تھی وہ دونوں پیراپٹ پر کھڑے تھے، جب کہ ونائی نے پوچھا ــ" شکو! بول

تو سہی کیا ہوا؟" شکو نے ایک فریادی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔
"تم نے میری ضمانت دی ہے؟" ونائی نے پوچھا۔
"--------"
"کیسے دی ہے؟ تمہارے پاس۔۔۔؟"
شکو نے حقارت کی نظر سے ونائی کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں زبان سے زیادہ ناطق تھیں جو کہہ رہی تھیں ـــــ مرد کی جات، کُتّے کی ہے۔۔۔"
وہ اگر اپنی زبان کو شرمندۂ الفاظ کرتی تو ونائی کہتا ـــــ کُتّے کی نہیں، بھیڑیئے کی۔" مگر وہ وہی بیگانی چال چلتی ہوئی سڑک پار کر گئی اور قدوائی روڈ کی پیٹری پہ ہولی۔ ونائی نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا اور بولا ـــــ "شکو۔۔۔"
شکو پلٹ کر اُلٹ کر ونائی سے آ لگی۔ یوں معلوم ہوا جیسے وہ اس کی چھاتی پہ اپنا سر رکھ کر اپنا دکھ رو دے گی، سُکھ پولے گی۔ مگر نہیں۔ شکو نے اپنا ہاتھ چھُڑا لیا۔ اُسے ونائی سے نفرت تھی، اپنے آپ سے نفرت تھی۔۔۔ وہ چل دی!
ونائی بھونچکا کھڑا رہ گیا اور شکو کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا جس نے اپنے کاشٹے کا پلومُنہ میں ٹھونس لیا تھا اور روتی ہوئی جا رہی تھی۔ سامنے بائیں ہاتھ پہ ہاسٹل، ہار ریبر برانچ کی ریلوے لائن اور اینٹوپ ہل کی جھونپڑ

پٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

ونائی سب جان گیا تھا، سب سمجھ گیا تھا۔ وہ کتنا کہنا چاہتا تھا۔

"شکو، تم نہ دوشش ہو، کنواری ہو... انھی حالات میں سبزی بیچنے والی شانتا کو اس کے پتی نے گھر سے نکال دیا تھا اور آج وہ فارس روڈ کی جنگو بائی کے قحبہ خانے میں رہتی، دھندہ کرتی ہے۔ روز رات چھ سات مرد اسے روندتے دلتے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس سے کم ہوں تو نہ وہ میڈم، نہ دلال کے پیسے دے سکتی ہے اور اسے پھیری والے کی سوکھی روٹی اور مرچ کھانی پڑتی ہے۔ لیکن وہ کنواری ہے کیونکہ نہ اسے اپنے گاہکوں سے محبت ہے نہ اپنے پتی سے تھی....

یہ کنوار پن... سب مردوں کی سازش ہے تاکہ عورت جان ہی نہ پائے کہ مرد میں کیا ہوتا ہے، ایک اور دوسرے میں کیا فرق ہے؟ مگر اس کا کیا علاج جب کہ عورت خود ہی اس سازش میں شامل ہو گئی ہے!

ونائی کا خیال تھا، شکو اُسے بلائے گی، لوٹ کر آئے گی۔ مگر نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو اب ونائی کے قابل نہ سمجھتے ہوئے جا رہی تھی۔ ونائی نے آخری بار اسے اپنی نظروں کی سرحد پہ دیکھا اور چلاّ اُٹھا۔ "میں ۳ اکتوبر نہیں آنے دوں گا.... میں تین اکتوبر نہیں آنے دوں گا....."

اور اسی عالم میں وہ بھاگتا ہوا ماٹنگا کی ٹریفک میں کہیں گم ہو گیا۔ (تمام)

حجّام الٰہ آباد کے

میں جہاں ڈائیک پر کھڑا ہوں، یہاں سے نظارہ بہت خوبصورت ہے... یہ گدلی گنگا، وہ نیلی جمنا اور بیچ میں کہیں سرسوتی مائی ہے، جو آج تک کسی کو نظر نہیں آئی ہے۔ ہم ان تینوں دریاؤں کو تربینی بھی بول دیتے ہیں اور جی میں آئے تو ان کے ملاپ کی وجہ سے اسے سنگم بھی کہہ ڈالتے ہیں۔ موڈ موڈ کی بات ہے...

یہ سنگم یوں تو اور بھی بہت سے کام آتا ہے لیکن کسی مرے ہوئے لیڈر کی ہڈیاں بہلانے کے لئے بہت ہی اچھا ہے۔ یہ قلعہ جو آپ دیکھ رہے ہیں مغل شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا۔ اس کی نگاہ کتنی دور رس تھی گویا وہ صدیوں پہلے جانتا تھا کہ چین کی طرف سے حملہ ہوگا تو یہاں پہنچتے پہنچتے تو رک ہی جائے گا۔ کچھ دریا روک لیں گے رہا سہا یہ قلعہ روک لے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جمنا کا پانی آج تک اس قلعہ کے

پیر دھو دھو کر پیتا ہے۔

پیچھے الہ آباد کا شہر ہے نہ معلوم اسے کس فقیر کی دعا لگ گئی کہ ہر سال گنگا اور جمنا میں باڑھ آنے پر بھی یہ نہیں ڈوبتا۔ دارا گنج کے آس پاس کچھ جھونپڑیاں کچھ پکے مکان ہیں جن کی کلی دے کر یہ پھر سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کوئی زچہ چھٹی نہا کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ آج شہر پہ کوئی دھند سی چھائی ہے یا شاید لوگوں کی آہوں کا دھواں ہے، فضا کی سرد مہری جسے اوپر نہیں اٹھنے دیتی نیچے زمین روکتی ہے اوپر آسمان ٹوکتا ہے لوگ بڑی خوشی سے گھٹ گھٹ جلنے والی ان آہوں کو پھر سے سانس بنا کر استعمال کرتے ہیں۔

دور بائیں طرف الہ آباد کا نیا اسٹیشن ہے جو کمبھ کے موقع پر آنے والے بے شمار یاتریوں کے لئے بنوایا گیا اور جس پہ ہماری سرکار کے لاکھوں روپے لگے ہیں۔ کوئی ضروری نہیں، اس اسٹیشن پر صرف جاتری لوگ ہی اتریں۔ ہم اور آپ بھی اتر پڑیں تو کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ لوک راج ہے نا — جیسے سماجی واد کی پوٹ لگی ہے جیسے بھانگ کو سنکھیے کی پوٹ لگا دی جائے تو وہ اور بھی تیز ہو جاتی ہے اسی طرح ہمارا یہ لوک راج اور بھی نشہ آور ہو گیا ہے — اسٹیشن کے پیچھے سول لائنز کا علاقہ ہے جسے بنا تو انگریز گیا۔ استعمال ہم کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں اس نے ایک گرجا بھی بنوایا جو بہت پکا ہے۔ پچھلی صدی میں چھاؤنی کے

جتنے انگریز افسر مرے، ان کی روحیں اب تک اس گرجے میں عبادت کرنے آتی ہیں اور خدا سے دعا کرتی ہیں کہ انہیں بہشت کے عیش و آرام سے چھٹکارا دلوا کر ایک بار پھر الہ آباد کی چھاؤنی میں بھیج دے... تو گویا ہر شام یہاں پڑا نانا الہ آباد تیل میں سر لبیاتے، انگوری منہ میں دباتے اس نئے مولون الہ آباد سے گلے ملنے چلا آتا ہے اور کافی یا وسکی پی کر کسی مولوی کی طرح چوری کی مرغی بغل میں دبائے کہیں بھی نکل جاتا ہے۔

میں ــــ مجھے الہ آباد ہی کا سمجھو۔ یوں میں بیلہ ٹکٹی کا رہنے والا ہوں جو یہاں سے پچاس ساٹھ میل پرے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، برسوں پہلے، ایک امیر بڑھے نے بیٹھے بیٹھے منوں ہی سن بانٹ ڈالی، سینکڑوں ہی روپے بنائے لیکن سب کے سب میری پڑھائی پر ڈبو دیئے۔ خود تو اندھا ہو گیا، پر مجھے دیکھنے لگا۔ یہ کالا اکھڑ، جو ہمارے دیس کے بہت سے لوگوں کو برا بر معلوم ہوتا ہے مجھے بھوری بیڑیا نظر آتا ہے۔

میں، اس اُلٹی طرف بمرولی کے ہوائی اڈے پر کلرکی کرتا ہوں... دس بجے مجھے دفتر پہنچنا ہے۔ لیٹ ہو گیا تو میرا سیکشن انچارج بہت خفا ہو گا۔ وہ بے حد نروس آدمی ہے اور بلڈ پریشر کا مریض بھی۔ مجھے اپنا تو کچھ نہیں، البتہ مجھے گالی دیتے ہوئے وہ کانپا، منہ پہ جھاگ لایا اور گر گیا تو پھر ــــ میرا کیا ہوگا؟....

لیکن خیر... کوئی بات نہیں، ابھی بہت ٹائم ہے۔ پھر لوک پتی کے گاہک بھی

دھیرے دھیرے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

ہاں تو، وہاں برول کے ہوائی اڈے پر جب میں آفس کے کیبن میں بیٹھتا ہوں تو کھڑکی سے مجھے ہوائی جہاز اُترتے چڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ رن وے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بڑا، جیٹ ہوائی جہاز تو کوئی نہیں آتا، البتہ چھوٹے چھوٹے جیٹ سے بیسیوں آتے ہیں۔ سیبل چڑھے غسل خانے میں ریت کھی جیسے اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح یہ جہاز ایکا ایکی آسمان کے کسی کونے سے ٹپک پڑتے ہیں۔ اگرچہ وہ سب چھوٹے ہیں لیکن آدمی ان میں سے بڑے اُترتے ہیں۔ کبھی کبھی سانپوں، رسہ اچھالنے والے مداریوں ہاتھیوں، راجاؤں، مہاراجاؤں اور ننگا سادھوؤں کی تلاش میں باہر سے ٹورسٹ بھی آجاتے ہیں اور ہمیں اس درجہ خوش دیکھ کر بڑے دکھی ہوتے ہیں۔ بس میرا تعلق باہر کی دنیا سے صرف اتنا ہی ہے اور یا پھر میں اخبار "لیڈر" پڑھ ڈالتا ہوں۔

اب لوک پتی زیادتی کر رہا ہے۔ وہ دیکھو اس نے ایک اور گاہک کو پکڑ لیا۔ میں اس کی طرف نظروں سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہتا ہوں "دیا کرو، لوک پتی! ... میری حالت پر ترس کھاؤ۔"

"ابھی لو، بوا" لوک پتی کہتا ہے "ابھی پٹ سے سب صفاچٹ ہوا جاتا ہے" اور اپنے استرے سے وہ گاہک کے چہرے پہ دو ایک خوبصورت سے

خط بنا دیتا ہے...

"مجھے دفتر جانا ہے۔"

"سبھوں کو جانا، ہوا، سبھوں کو جانا ہے۔"

اور لوک پتی کی آوازیں ہار سے ملی جلی، ایک فلسفیانہ سی جیت ہے جس کی بنیاد، ہمارے صدیوں کے پرانے گرنتھوں اور شاستروں پر قائم ہے معلوم ہوتا ہے اس وقت وہ میرے دفتر کی نہیں، بھگوان کے گھر کی بات کر رہا ہے، مرگھ جہاں ــــ سبھوں کو جانا ہے!

سوا آٹھ ہو گئے... زندگی بیتی جا رہی ہے، دفتر بیتا جا رہا ہے... یہاں سے گھر، گھر سے دفتر، دفتر سے شمشان... بیچ میں ازل ہی سے تھکی ہاری بیوی سے جھپٹ... مار کی بجائے کھانا کھاتا... کھانا بھی وہ جو پکار پکار کے کہہ رہا ہے کھا، نہ، کھا، نہ... سوائے گود کے بچے کے باقی کے سب یا تو اسکول جا چکے ہوں گے اور یا باہر مٹی میں رُل رہے ہوں گے۔ میں تو کہتا ہوں رُل ہی جائیں تو اچھا ہے... ارے ہاں! ایک بات تو آپ کو بتائی ہی نہیں۔ میں جواہر نگر میں رہتا ہوں۔ جسے بنے بہت عرصہ نہیں ہوا، اس لئے سارے کا سارا نگر دھول اور مٹی سے اٹا ہے۔ میں مٹی کو بہت پسند کرتا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ میرا اور آپ کا، سب کا خمیر مٹی سے اُٹھایا گیا ہے اور دوسرے اس لئے کہ جب تک کسی بچے کو مٹی کا چُمبن نہ ملے، وہ سالا پنپتا ہی نہیں۔ بس

بس روپیہ پانے والے، ٹیوشنوں پر جینے والے اسکول کے ٹیچر اس بات کے معنو کو کیا سمجھیں؟ ذرا کسی بچے کے کپڑوں پر مٹی دیکھی الٹا ماں کے پاس بھیج دیا، جو پہلے ہی گھبرا رہی ہے۔ عورتوں کی زبان میں، میری پتنی پاجامے سے بھی چھو جاتے تو اسے پیٹ ہو جاتا ہے۔

نیچے ڈائنگ بھی بھری بھری ہے یا شاید دفتر سے لیٹ ہو جانے کا ڈر ہے جس کے کارن زمین پاؤں تلے سے سرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں پہلے، کمبھ کے میلے پہ جو سینکڑوں ہزاروں لوگ سٹام پیڈ میں دب گئے تھے، ان میں سے کوئی بچ گیا اور اب منوں مٹی کو سر پہ سے ہٹاتے ہوئے، باہر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سن رہے ہو؟.... معلوم نہیں ہوتا جیسے دور، نیچے سے ایک کورس کی آواز آ رہی ہے۔ آہستہ چل ہو سکے، تو چل ہی مت۔ تیرے قدموں کے نیچے ہزار جانیں ہیں؟

لوگ جیسے پاتال سے نکلنے کا جتن کر رہے ہیں قلعے کے اندر جہاں اوپر بندر ہیں، نیچے بہت سے مندر ہیں۔ کوئی کرشن جی کا، کوئی مہابیر جی کا اور کوئی کالی مائی کا۔ وہ سب قلعے ہیں، زمین کے نیچے کچھ یوں دبے ہوتے ہیں کہ ان کے اندر جاتے سے بھی ڈر آتا ہے۔ لیکن اگر انسان آسمان کو تھگلی لگا سکتا ہے، چاند ستارے سے گلے مل سکتا ہے تو کیا نیچے پاتال تک ہی نہیں پہنچ سکتا؟ اس بیل کے سینگوں کو نہیں چھو سکتا جو صدیوں سے ہماری اس دھرتی کا بوجھ اٹھاتے کھڑا ہے اور

وہ بھی ایک سینگ پر؟ جس کے کارن ہماری زمین سورج کے گرد ٹیڑھی گھومتی ہے اور پیکا رکے موسم بناتی رہتی ہے۔ آج پوس پڑ رہی ہے کل جھلس دینے والی لُو چل رہی ہے۔۔۔ ابھی بارش سے برباد ہو رہے ہے، پھر اوڑ لگنے سے مر رہے ہیں۔۔۔ اب کے جو لوگ پاتال سے آئے ہیں عجیب سی خبر لائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے بیل بس سینگ بدلنے ہی والا ہے جس سے ساری دنیا ہل جائے گی سب تحس نحس ہو جائے گا۔ نیچے کا اوپر، اوپر کا نیچے، دائیں کا بائیں۔۔۔ ڈینک زمین کانپتی رہے گی اور آخر تھم جائے گی اور صدیوں تک تھمی رہے گی پھر بیل اسی وقت سینگ بدلے گا جب سائنس اتنی ترقی کر جائے گی کہ ہل دھرتی پہ چلنے کی بجائے، دھرتی ہل پہ چلنے لگے گی۔ عورت کے پیٹ میں خالی ہوا رہ جائے گی اور مرد کے پیٹ میں بچہ ــــ

لوک پتی کا نیا گاہک چلا آ رہا ہے۔ بات یہ ہے اس نئے گاہک کی حجامت شروع کر کے، اس کے چہرے پر تین چار خوبصورت سے خط لگا کے لوک پتی نے اس غریب کو بیچ ہی میں چھوڑ دیا ہے اور ایک نئے گاہک کو پکڑ لیا ہے اب وہ پہلا گاہک لوک پتی سے لڑ رہا ہے، اسے گالی دے رہا ہو۔۔۔ ارے! یہ کیا ہوا؟ دہائی لاٹ صاحب کی۔۔۔ وہ پہلا گاہک چپکے سے چل دیا۔ وہ۔۔۔ میری طرف آ رہا ہے!

میں ــــ اسے جانتا ہوں۔۔۔۔

"اُگمہ؟ .... اگمہ سین ...."

"ہاں، جل توری! ـــــ تو یہاں کیسے؟" وہ مجھے دیکھتے ہوئے کہتا ہے.. یوں میرا نام بدھیان چند ہے لیکن میرے ویجی ٹیرین ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ مجھے جل توری ہی کہہ کر پکارتا ہے اور میں بھی اسے نہیں بتاتا کہ جل توری اصل میں مچھلی کو کہتے ہیں جو مانس سے بنی ہوتی ہے اگر را ہو اور کتلا ہو تو اس میں پھر نام کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہی نہیں۔ پھر اگمہ مجھے جل توری پکارنے کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ پچھلے چناؤ میں میں نے کانگریس کو ووٹ دیا تھا۔ آج تو وہ لوک پتی پہ خفا تھا، ورنہ ہمیشہ وہ مجھے ماں بہن کی یہ موٹی موٹی گالیاں دیا کرتا ہے۔ میرا بڑا متر ہے!

میں کہتا ہوں "بھاتی میں تو اشنان کرنے آیا تھا، سوچا حجامت ہی کیوں نہ بنواتا جاؤں؟ اپنا اُسترا ذرا کند ہوگیا... کوئی سلّی ہی ملتی اسے لگانے، تیز کرنے کے لیے۔"

"تم بھی سیفٹی استعمال نہیں کرتے؟" اگمہ مجھ سے پوچھتا ہے۔

"آں ہاں..." میں کہتا ہوں "سیفٹی کے ساتھ مزا نہیں آتا۔"

"تف" اگمہ سر ہلاتے ہوتے کہتا ہے "یہ ہم ایسے ان سائنٹیفک لوگوں ہی کی وجہ سے ہے جو اِدھر بیوپوں کو اور اُدھر دیس بھر کو مصیبت پڑی ہوئی ہے دن دونی رات چوگنی، آبادی بڑھتی جا رہی ہے ہم ایسوں کی۔"

" تو پھر کیا کہنا چاہیئے ؟ "

" تمہارے اور میرے جیسے لوگوں کو تو خشتی کہہ دینا چاہیئے۔ اس سے تو اچھا ہے، حجامت کے لئے وہاں، سیلون چلے جایا کرو۔"

" نہ بھیا، میں کہتا ہوں، سیلون مہنگا پڑتا ہے۔ گھر ہی اچھا ہے۔ تو آج ان کے چکر میں کیسے پڑ گیا ؟ "

" کیا بتاؤں یار ؟ " اگر داڑھی کے ان کٹے حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہے۔ " میونا تھ سے میرے متوسا دینا نا تھ آتے تھے، کہنے لگے سنگم پر نہائیں گے بس نے کہا۔ نہائیے، میرا کیا جاتا ہے ؟ جب تک میں حجامت بنوالوں گا . . . . اور یوں میں ان کمینوں کے چکر میں پھنس گیا۔ "

اور میں اگر سین کی طرف دیکھ کر ہنستا ہوں لوک بی نے اس کے چہرے پر کیا خوبصورت ڈاک بنگلہ دیا ہے۔ یعنی کہ مکان بھی ہے اور لان بھی ہے۔ ایک طرف سفیدی، دوسری طرف سیاہی، معلوم ہوتا ہے، اپنے ہی ساتھ منہ کالا کیا ہے . . . اور پھر یکا یک میری ہنسی بند ہو جاتی۔ میں بھی تو ایسا ہی لو دم لگ رہا ہوں۔ اگر سین کہیں منہ نہیں دکھا سکتا تو میں بھی دفتر نہیں جا سکتا۔

ایک ہمدردی کی نظر سے اگر سین کی طرف دیکھتے ہوئے میں اپنی بانہیں اس کے گرد ڈال دیتا ہوں اور کہتا ہوں " کوئی بات نہیں، دوست ! زندگی میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ "

"زندگی کی ایسی تیسی،" اگر سین ایک دم آگ بگولا ہو کر کہتا ہے۔ بجائے اس بات کے کہ اس کی تسلی ہو میری ہمدردی کے الفاظ جلتی پر تیل کا کام کر جاتے ہیں اور وہ گالیاں جو اگر مجھے دبا کر تا تھا، حجاموں کو دینے لگتا ہے۔ "ان کی ماں کی . . . ہر بات میں نفع خوری! اس نے پورے ملک کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔"
اور پھر ایک اور گالی، پہلی سے ذرا چھوٹی عمر کی اور کنواری . . . مجھے بڑی جلن ہوتی ہے، میری بجائے اس نے لوک پتی کو اپنا سالا بنا لیا ہے۔
"سنو اگر،" میں پوچھتا ہوں "تم کب سے اہنسا کے قائل ہو گئے ہو؟"
"کیا کرتا۔"
"ارے لگاتے پکڑ کے اسے، دو چار۔"
اور ایسا کرنے میں میں اپنا مکا زور سے ہوا میں گھماتا ہوں۔ منہ میں گالیاں منمناتا ہوں جو سب نامرد لوگ کرتے ہیں ـــ "کیوں تم نے اس کی پٹائی نہ کی؟"
"کیسے کرتا؟" اگر سین حجاموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے "یہ سامنے کینٹ ہیں نا، ان میں جتنے بیٹھے ہیں، سب کے ہاتھ میں ایک ایک استرا ہے۔"
پھر ہم دونوں مل کر ہنستے ہیں، ایکا ایکی خفا ہو اُٹھتے ہیں اور پھر ایک دوسرے کے لنڈورے منہ کی طرف دیکھ کر کھلی مار اُٹھتے ہیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جیسے کیسے بھی ہیں، اپنے دیش کے نائی ہیں۔ ہمارے بیٹے بیٹیوں کا بھی رشتہ لاتے والے ہیں۔ چلیں ان کے سامنے کا جھگڑا نہیں مول لینا چاہیئے۔ آخر تو اپنا گلا

ان ہی کے ہاتھ میں آنا ہے ــــــ ۔

سنگم پر عورتیں نہا رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کا بھی جسم اچھا نہیں، کسی کا پیٹ لٹکا ہوا ہے، کسی کی ٹانگیں اوپر اٹھی ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے نیشنل بنک کا ٹیلر (TELLER) جو ادھ ننگی کمرسی پر بیٹھا ہوا پبلک کے ساتھ بزنس کر رہا ہے۔ ایک بڑھیا ہے شہر کے گوالوں نے جس کی ممتا کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا اور بھرے بازار بیچ ڈالا پیٹھ سے لگا ہوا اس کا پیٹ، سوکھی مرگھلی ٹانگیں اور ٹھنٹ سے بازو ہیں جو دیکھنے۔ بس اوپر اٹھ کر سورج بھگوان کو انجلی ارپت کر رہے ہیں لیکن اصل میں لپک لپک کر گنبدری سرکار کے محکمہ خوراک کی جان کو رو رہے ہیں۔ جیسے ہماری تصویر "پاتھیر پانچالی" بدیس پہنچی ہے اور وہاں کے لوگوں نے بہت پسند کی ہے اسی طرح باہر کے لوگ اس بڑھیا کی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوں۔ فوٹوگرافی میں دنیا کا سب سے بڑا انعام اسے ملے اور دنیا بھر کے ملکوں سے غلے کے جہاز کہیں اور چلنے کی بجائے ہندوستان کی طرف پلٹ پڑیں... اچھی عورتیں ہمارے ملک میں کہاں رہ گئیں؟ وہ تو اب صرف کلینڈروں پر دکھائی دیتی ہیں بنتر طیکہ وہ بھی "لیڈر پریس"، میں چھپے ہوں... ارے نہیں بھائی، اب بھی کہیں کوئی ایک آدھ دکھائی پڑ ہی جاتی ہے۔ وہ دیکھو سامنے... ایک نوعمر، نوخیز لڑکی بھی ہے چلو ایک تو ہے جس نے صبح کے خالی منظر کو بھر دیا اور رام دھن کی یکساں اور تھکا دینے والی آواز مرتعش کر دی... وہ ساری سمیت نہا رہی ہے، لیکن

بے چاری، شرم کی ماری، ساڑھی کے بغیر بھی ہوتی تو نظر نہ آتی؟۔۔۔ پانی کی وجہ سے کپڑا اس کے بدن کے ساتھ چپک جاتا ہے، اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جسے وہ بار بار اپنے آپ سے علیحدہ کرتی ہے۔ ہندوستانیوں کی پوری قوم کی طرح وہ اپنے جسم کو ناپاک اور نجس سمجھتی ہے اور اس غلط فہمی میں ہے کہ گنگا کا پانی اس کے عورت پنے کی گندگی اور میل کو دھو ڈالے گا، اس کے جسم کو پاک کر دے گا۔ کوئی بھی پانی اس کے جسم کو پاک نہیں کر سکتا کیونکہ وہ پانی جس سے زندگی عبادت ہے، اس میں وہ کھل کے نہا نہیں سکتی۔ اس میں نہائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ اس کے بھائیوں کو اس احساس سے کوئی نہیں نکال سکتا کہ وہ جی رہے ہیں تو کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ ان کے ذہن کی گہرائیوں میں یہ چیز بس چکی ہے کہ گائے کے دودھ پر صرف بچھڑے کا حق ہے اور وہ دودھ پیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچھڑے کے ساتھ پاپ کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔۔۔۔

ہا! یہ دنیا دکھ کا گھر ہے جس میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا رہی ہے۔ سانس بھی لیتے ہیں تو ہزاروں کیڑے ہوا کے ساتھ اندر جاتے ہیں، ہلاک ہو جاتے ہیں کیا کوئی ذریعہ نہیں — بڑا ان اور شاستر کا کوئی حوالہ نہیں اس سچ کو جھٹلا سکے کہ زندگی کا معیار زندگی پر ہے؟ چلو، زندہ رہنے کے لئے اگر زندگی لینا ہی ضروری ہے تو کم سے کم نتو توں کا ناش کیا جائے۔ مرد میں پانچ نتو ہوتے ہیں۔ ہوتے عورت میں بھی پانچ ہی ہیں لیکن ہر دوسرے سال خاک

اور خون میں لتھڑنے، بچے پیدا کرنے، گھر بار میں اُلجھے رہنے کی وجہ سے آخر ساڑھے چار رہ جاتے ہیں۔ گائے، گھوڑے اور بکری میں چار، مرغی بٹیر میں تین، کیڑے مکوڑوں میں دو، اور پھل سبزی میں ایک... اس لئے پھل اور سبزی ہی سے پیٹ کا نرک بھرنا اچھا۔ آخر ایک ہی تنو کا ناش ہوتا ہے نا...

ارے، یاد آیا... مٹی اگرچہ اُپجاؤ ہوتی ہے اس پہ بھی اس میں آدھا یا کوئی بھی تنو نہیں ہوتا اس لئے مٹی کھانی چاہیئے۔ میں، بدھان چند، پرکھوں اچھا مندو ہونے کے کارن کل سے مٹی ہی کا بھوجن کیا کروں گا۔

کشتی والے دھڑا دھڑ تنر دھا مارے لوگوں کو بیچ منجدھار کے لے جا رہے ہیں۔ جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتے ہیں۔ پانڈے لوگ پوجا کے پھول ٹوکریوں میں لئے انہیں دے رہے ہیں اور مختلف بہانوں سے پیسے بٹور رہے ہیں۔ ہاں پھول زمین پہ تھوڑے اُگتے ہیں؟ وہ زمانہ گیا جب کمل اپنے آپ کھل جایا کرتے تھے اور دھرتی کا الہاس اوپر چلا آیا تھا اور اس کی چھاتیوں پر مونیا اور کرنے اور مرد کے ساتھ چنبیلی، گلاب اور صد برگ کے نقش و نگار بنا دیا کرتا تھا۔

یہ لیجئے نو بج گئے ـــــ اب ہم نرج، ہونے لگے ہیں۔

میں اور اُگر سین دونوں ٹہلتے ہوتے لوک پتی کی طرف جانے لگتے ہیں جبھی لوک پتی کا تیسرا گاہک بھی اپنی طرف آتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ میں ایسے

نہیں جانتا۔ لیکن شکل ہی سے وہ اپنی برادری کا جان پڑتا ہے ۔۔۔ ویسے ہی آدھا منڈا ہوا، ویسے ہی دو چار خط چہرے کے بائیں طرف لگے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔
میں ذرا ہمت کر کے آگے بڑھتا ہوں اور اس سے پوچھتا ہوں ۔

" کیوں بھیا، کیا حال ہے ؟ "

" اچھا ہے ۔ " وہ کچھ جھینپ کر کہتا ہے ۔

" کیا دیکھ رہے ہو ؟ "

" یہی دُنیا کے رنگ "

اور پھر وہ داڑھی کے ان کٹے حصے پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے کیا دیکھتے ہیں کہ ہم تینوں ہنس رہے ہیں اور پھر یکا یک ہی خفا ہو اُٹھے ہیں ۔ میں اگر سے کہتا ہوں یہ ٹھیک ہے، لوک پتی کے ہاتھ میں اُسترا ہے ۔ لیکن اگر ہم تینوں مل کر اس پر جھپٹ پڑیں تو وہ ہماری داڑھی صاف کرے یا نہ کرے ہم ضرور اس کی طبیعت صاف کر سکتے ہیں ۔ "

اگر شک وشبے کی نگاہ سے میری طرف دیکھنے لگتا ہے جیسے کہہ رہا ہو ۔ " تینوں مل کے ؟ " گویا کہ ہم تینوں کبھی مل ہی نہیں سکتے اور اگر مل گئے تو پھر ہم ہندوستانی نہیں، ضرور ہم میں سے کسی کی رگوں میں بدیشی خون دوڑ رہا ہے اگر مجھے دفتر نہ جانا ہوتا تو بھائی میں تو ضرور ان کے ساتھ مل جاتا ۔ ہاں یہ تیسرا بھائی ہمارا ۔۔۔ خدا معلوم اس کی کیا آئیڈیالوجی ہے ؟

ہمارا تیسرا بھائی پنکارنے لگتا ہے۔ وہ لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف زہر اُگلنے لگتا ہے ــ "یہ لوٹ کھسوٹ، یہ نفع خوری غیر قانونی ہے غیر جمہوری ہے۔ ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے، بغاوت کرنی چاہیئے" اور پھر وہ دور ہی سے حجاموں کو دھمکیاں دینے لگتا ہے جب وہ شروع ہوا تھا تو میں سمجھا اس کے ہاتھ میں اُسترے سے بھی تیز کوئی ہتھیار ہوگا جسے گھماتے ہوئے وہ زور سے للکارے گا دنیا جہان کے ان منڈے لوگوں کو اکسا بھڑکا کر اپنی مدد کے لئے آمادہ کرے گا اور لوک پتی اور اس کے ساتھیوں کا خون کر ڈالے گا۔ لیکن یہ جان کر دُکھ بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی کہ وہ بھی ہماری طرح پارلیمنٹری ڈیمو کریسی کا قائل ہوگیا ہے، جہاں ہم تقریبیں کرکر کے ہار چکے ہیں، وہ نیا بھرتی ہونے کی وجہ سے ابھی تک جوش کے عالم میں چلا رہا ہے۔ زمین سے چار چار فٹ اوپر اُچھل رہا ہے۔

" یہ لوک پتی"، وہ کہتا ہے "کہیں باہر سے دو اکھر تو پڑھ آیا ہے، اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگا ہے۔ دنیا جہان کی بہو بیٹیوں سے آنکھیں لڑاتا پھرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ جب وہ اپنے کام میں مشغول ہوتا ہے اس کی بیوی اسٹیل والے ایک سیٹھ کے ساتھ راس رچاتی رہتی ہے لڑکی ایک سٹی کے پیچھے بھاگتی پھرتی ہے اور لڑکا چور بازار کے کوٹھوں کا طواف کرتا ہے . . . . "

یہ تیسرا بھائی ہمارا یہاں کے سب حجاموں کو جانتا ہے، سب کے چھٹے کھول کھول کر ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ یہ اسی نے بتایا، ان میں تین چار اچھے حجام تھے جو پوری حجامت بنانے کے قائل تھے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ایک ایک کر کے مرگئے اور یا باقیوں کے تنور چلانے کی وجہ سے نکال دیئے گئے وہ سب لوک پتی کے دوست تھے اور ان کی وجہ سے لوک پتی سب کچھ کہہ سکتا تھا، کیونکہ اس کی سوجھ بوجھ اچھی تھی، نیت صاف تھی، لیکن ان کے چلے جانے کے بعد وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ مجبوراً اسے دوسروں کی حرکتوں پر خاموش رہنا پڑتا ہے۔ اور کبھی وہ خود بھی وہی کرنے لگتا ہے جو اس کے باقی کے حجام ساتھی کرتے ہیں۔ ان حجاموں کے علاوہ دوسرے جوڑ توڑ سے باہر بیٹھے ہیں، اس کھیل کے قاعدے قانون سے واقف ہو چکے ہیں۔ الٰہ آباد شہر جس کے نیچے کہیں سرسوتی بہتی ہے کسی ایسے شخص کو جذب نہیں کر سکتا جو پڑھا لکھا نہ ہو۔ اگر اتفاق سے کوئی ان پڑھ آ بھی جائے تو چند ہی دن میں وہ اتنا پڑھ جاتا ہے کہ یونیورسٹی کا کوئی بھی اچھے سے اچھا دویارتھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ الٰہ آباد کے حجام آدمی بڑے مزے کے ہیں، خوب دور کی سوچتے ہیں، لمبی چوڑی یوجنائیں بناتے ہیں، جن میں سے پوری ایک بھی نہیں کر پاتے۔ بس بھاشن دیتے ہیں اور صرف بھاشن۔ زبان کے معاملے میں رائے ضرور رکھتے ہیں۔ لیکن اسے عملی جامہ پہنانا تو ایک طرف ننگا بھی گھومنے نہیں دیتے۔ آپس میں

مل کر کچھ گوشٹی سی کرتے رہتے ہیں... ان میں سے ایک شاعر ہے جس کا نام چندربھان ہے اور جو دیوگ تخلص کرتا ہے۔ ہندی کے چھند سے اردو کو عقلمند بناتا ہے طبیعت اس قدر حاضر ہے کہ اپسرا کی بجائے دیوبالکوں کو پسند کرتا ہے، جانتا ہے ناکہ عورت سے پیار تو ایک قدرتی بات ہے لیکن مرد سے پیار سُراُچ کلا...

ایک دن بیٹھے بیٹھے چندربھان دیوگ نے بہت پی لی اور رویا کے عالم میں بہت رویا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ پیغمبر ہے، ہاتے، دنیا نے نہیں سمجھا۔ میں نے کہا "کوئی بات نہیں دیوگ جی۔ دنیا آج نہیں تو کل سمجھ لے گی..." پھر مدسودبر لکے سب راز چندربھان دیوگ پر کھل گئے اور وہ نشے میں دھت رہنے لگا۔ اب وہ جیون کے رنگ منچ پر آتا تو خوب ہی لڑکھڑاتا۔ لوگ اس کے لڑکھڑانے کو بھی ابھنے کی ایک قسم سمجھتے۔ جیسے ناچتے ناچتے اس کے باقی ساتھی تو رنگ منچ کے ایک ونگ میں گئے سو، گئے...

چند ہی برسوں کی بات ہے الہ آباد کے ان حجاموں میں پنجاب کا ایک حجام آگیا، بس، پھر کیا تھا، سب لٹھ لے کر اس کی طرف دوڑے اور اسے نکال پھینکنے کی ترکیبیں لڑانے لگے۔ لیکن وہ بھی ایک ہی بدمعاش تھا۔ باقاعدہ سینہ تان کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اگر کسی نے ایک اُسترا نکالا تو اس نے دو نکال لیے باقی کے حجام ڈر کر بیٹھ گئے اور سامنے ہو کر لڑنے کی بجائے "ہتی" کی باتیں کرنے لگے۔ وہ گھاگ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے اپنے کیبن کے پیچھے سے کچھ تختے نکال

کمرہ ایک کھڑکی بنالی اور اس پر ایک بورڈ لگا دیا ــ کوشک چیری ٹیبل ہومیو پیتھک ڈسپنسری " اور کچھ دوائی کی شیشیاں رکھ لیں ــ سمدر ٹنکچر، چھ ایکس ٹوینٹی تیس، دوسو، ہزار، پچاس ہزار، لاکھ کی پوٹینسی ــ ریچ کیا تھا۔ آس پاس کے غریب غربا، بنا پوٹینسی کے سب لوگ علاج کے لئے اس کے پاس آنے لگے دوسرے حجام لوگ بدکے۔ ایک میٹنگ کر کے انہوں نے اس کے خلاف فیصلہ کر لیا، لیکن سبب تک کوشک کمیٹی کی حمایت حاصل کر چکا تھا۔ اس سے گرانٹ بھی لے چکا تھا۔ اب اسے وہاں سے کوئی نہ ہلا سکتا تھا چنانچہ آج تک وہ وہاں بیٹھا سب کی چھاتی پہ مونگ دل رہا ہے۔ چہ جائے کہ باقی کے حجام اس کا کچھ بگاڑ سکیں، اپنے بھی بیٹے بیٹوں کے رشتے ناتے ہونے کے ناطے اس سے کرواتے ہیں۔

اس پہ طرہ یہ کہ ان کے بیچ ایک سکھ حجام بھی چلا آیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اس کا کاروبار کیا چلے گا جس کی اپنی سیتو نہیں بنی ہے۔ لیکن صاحب جو اندازہ سیلانے کا ہوتا ہے، دیوانے کا نہیں ہوتا، اُلٹا اس کے پاس زیادہ گاہک آنے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ بالوں کے بارے میں جتنا یہ جانتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا، اگر اسے بالوں سے محبت ہوگی تو ایسی پیاری شیو بنائے گا کہ راہ چلتی لڑکی گال سے گال رگڑے گی۔ اور نفرت ہوگی تو یوں کھونٹی سے اکھاڑ پھینکیں گے کہ سات جنم تک ٹھوڑی پہ بال اُگیں گے،

نہ دماغ میں خیال پیدا ہوگا۔

یہ تیسرا بھائی ہمارا اسکم کے نابیوں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اگرسین کو آنکھ مارتا ہوں اور کہتا ہوں ــــ بھائی، میں تو چلا، ساڑھے نو ہوگئے۔ "

" اگرسین حیرانی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے " ایسے ہی چل دوگے، چل تو رہی ہے؟ "

" کیا کروں؟ " میں کہتا ہوں " گیا تو بیوی ہی چلی جاتے گی نا، نوکری تو نہیں جاتے گی؟ "

اور حسرت کی نظر سے لوک پتی کو دیکھتے ہوتے چل دیتا ہوں جس کے پاس ابھی تک گاہکوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ میرے من میں یہ خیال چٹکی لیتا ہے کہ شاید لوک پتی اب بھی مجھے بلالے۔ اور اگلے پانچ منٹ میں ٹک ٹک سے درست ہوکر جاؤں۔ لیکن صاحب، لوک پتی کو کہاں وقت ہے اور میں رکشے سے گھر پہنچ جاتا ہوں۔

وِدیا، میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہے۔

" ہائے جی، کیا ہوا۔ " وہ چوکھٹ پر میری آہٹ سنتے ہوتے بول اُٹھتی ہے۔

" کیا ہوا کیا؟ " میں پوچھتا ہوں۔

"کہاں بھانگ پی کے پڑ گئے ؟"

میں کوئی جواب نہیں دیتا، لیکن وہ کہے جاتی ہے "اتنا بھی نہ سوچا، دفتر کا وقت ہوگیا۔ تمہیں تو بس کوئی باتیں کرنے کو مل جائے . . ."

جبھی اس کی نگاہ میرے چہرے پر پڑتی ہے۔

"مہاری"، وہ کہتی ہے "یہ کیا ؟" اور پھر وہ دوپٹہ منہ پر کرتے ہوئے ہنسنے لگتی ہے۔ پھر اس پہ بس نہیں۔ پڑوس میں آواز دیتی ہے "جگن بھیّا۔ اسے ذرا ان کو بھی دیکھنا۔"

میں ہاتھ جوڑ دیتا ہوں "ودیا۔ بھگوان کے لئے . . ."

اور پھر وہ خود ہی دیکھنے کے لئے ہاتھ میری داڑھی کی طرف بڑھاتی ہے

"خبردار"، میں اس کا ہاتھ جھٹکتے، خفا ہوتے ہوئے کہتا ہوں "تو ہاتھ لگائے گی تو میں لات لگاؤں گا۔"

اور پھر میں سوچتا ہوں ——— اس میں بےچاری ودّیا کا کیا قصور؟ ایک سرد آہ بھرتے ہوتے میں اسے صرف اتنا ہی کہتا ہوں "شکر کرو تم عورتوں کی حجامت کسی لوک پتی نے نہیں تراوک پتی نے بنائی ہے۔" اور ایسا کہتے ہیں بس اوپر بھگوان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

"ہمیں اور تھوڑی مصیبتیں ہیں ؟"، ودیا کہتی ہے "تمہیں تو صرف ایک حجامت بنوانی پڑتی ہے۔"

اس کے بعد ودیا کھانا نکالنے لگتی ہے۔ میں غصّے میں کہتا ہوں "میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

وہ ہاتھ ملتے ہوتے کہتی ہے "ہائے جی، کیا اندھ ہے گھر سے گدھے پر سے اور غُصّہ غریب کمہار پہ نکال رہے ہو ۔۔۔؟"

پھر میں سوچتا ہوں ۔۔ کھانے کے ساتھ میرا کیا جھگڑا ہے۔ "اچھا، لاؤ کھانا" ودیا کھانا پروستی ہے میں جلدی جلدی نوالے منہ میں ڈالتا ہوں جو اوپر سے نیچے جانے کے بجائے، نیچے سے ۔۔۔ اوپر آنے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے میں کھانا نہیں کھا رہا، کھانا مجھے کھا رہا ہے یا کوئی ینولی کرم کرنے بیٹھا ہوں۔ کھانا کھاتے ہوتے ہمدردی، محض ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ودّیا کے سامنے اپنی آج کی مصیبت کی داستان دہراتا ہوں۔ وہ بے چاری، بھولی بھالی نہیں سمجھتی کہ اس کے منہ سے نکلا۔ ایک بھی ہمدردی کا لفظ مجھے کتنا دکھ پہنچائے گا۔ میرے بیان کے آخر میں وہ کہہ اُٹھتی ہے۔

"ٹھیکی پڑے ان نگوڑوں پر ۔۔۔ آج دفتر مت جاؤ۔"

"کیوں؟"

"خواہ مخواہ کیوں تماشا بننا۔"

اس پر میں ایکا ایکی بھڑک اُٹھتا ہوں "کیا مطلب؟ ۔۔ میری شکل ۔۔ میں اسے بھی تماشہ دکھائی دے رہا ہوں، کم از کم اسے تو یہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔

میں دفتر نہیں جا سکتا تو گھر بھی نہیں آسکتا؟ اور میں ودیا کو گالیاں دینے لگتا ہوں جو دراصل مجھے سنگم کے نائیوں کو دینا چاہئیں تھیں۔ ودیا اندر چلی جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں، مجھ سے ڈر گئی۔ لیکن وہ باہر آتی ہے تو ہاتھ میں ایک کٹوری لاتی ہے جس میں گرم پانی ہے۔ دوسرے ہاتھ میں شیونگ اسٹک اور اُسترا سیفٹی نہیں، وہی نوک پتی والا...

میں سوچتا ہوں۔ چلو اُسترا الگ ہے تو کیا۔ ذرا زور سے رگڑوں گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر بجائے اس کے کہ لوگ مجھ پر ہنسیں، میں ان پر ہنسوں گا۔ چنانچہ جلدی جلدی چہرے پر جھاگ پیدا کر کے میں استرا پھیرنا شروع کرتا ہوں لیکن صاحب استرا ہے کہ کہیں بھی ٹکنے کی بجائے، اوپر سے یوں پھسلتا ہوا ٹھوڑی پر آجاتا ہے۔ جیسے پارک میں سپنگ روسٹرم (SLIPPING ROSTRUM) سے بچے ایک دم پھسلتے ہوئے نیچے آرہے ہیں... میں جھلا کر پانی کی کٹوری نیچے پٹخ دیتا ہوں۔ اُسترا دور پھینک دیتا ہوں۔

"کیا بکواس ہے،" میں ہنکارتا ہوں۔ "یہ استرا اسے کس نے دیا تھا... تیرے میکے والوں نے۔ تم ہی نے سِلّی گم کر دی۔"

"کس نے سلّی گم کر دی؟"

"تم نے ——— روز نکال بیٹھتے ہیں۔"

"جھوٹ! تم ہی اس سے اردی چھیلتی رہی ہو۔"

" ودیا خفیف سی ہو کہ استرا اٹھا لیتی ہے۔ میں پلٹ کہ اس کی طرف دیکھتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ دوپٹے کے پیچھے اپنی ہنسی کو دبانے کی کوشش کر رہی ہے اور جب میں اسے شدھ انگریزی کے لہجے میں "شٹ اپ" کہتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے غلطی سے میں نے "بک اپ"، کہہ دیا۔ ایک ٹھاکا ہوری فضا کو بھر دیتا ہے اور ودّیا استرے کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے مجھے دکھاتی ہے "حجامت ہو بھی کیسے؟"

" اُلٹے ہی اُسترے سے اپنے آپ کو مونڈتے رہے۔"

میں دیکھتا ہوں جلدی کے عالم میں میں سچ مچ اپنے منہ پر الٹا استرا پھیرتا رہا تھا۔ ودّیا کہتی ہے "خواہ مخواہ میرے مائیکے والوں کا نام بدنام کیا۔"

" اچھا اچھا"، میں جُز بُز ہو کہ کہتا ہوں۔ ودّیا بول اٹھتی ہے "خبردار — اس میں سنگم کا کیا قصور؟ گنگا میّا کا کیا دوش؟ —— میں تو کہتی ہوں۔ میں مروں تو مجھے جلانا مت۔ گنگا میں میرا جل پرواکہ دینا ——"

اور میں یہی سوچتے ہوئے چل دیتا ہوں۔ گنگا میں جل پرواہ کیسی مان مریا والے یہ؟ کیسا پاگل پن ہے ہماری پوری قوم کا؟ اور مجھے یاد آتا ہے وہ دن جب میں دردیدی گھاٹ کی طرف گنگا میں نہانے نکل گیا تھا۔ سردی اور گرمی کے بیچ کے دن تھے گنگا میں جب باڑھ نہیں آتی تھی اور دریا منوں ہی بالو چھوڑ کہ خود کناروں سے بہت دور چلا گیا تھا۔ مجھے دریاؤں اور چشموں کا بہت شوق

ہے۔ باؤلے کُتّے کا کاٹا ہوا جتنا پانی کو دیکھ کر ڈرتا ہے، اتنا ہی میں پانی کے نظارے سے خوش ہوتا ہوں، پہلے کنارے کے پاس کی چکنی مٹی پیٹ پر ملتا ہوں جس سے جسم کی بیماریاں تو کیا دل اور دماغ کی بھی ساری الجھنیں جاتی رہتی ہیں پھر اڈولف کا سٹرباتھ لیتا ہوں جس میں اپنے بدن کے نہایت شرمناک حِصّے کو پانی میں ڈبو کر ایک ہاتھ سے پانی پیٹ پر ڈالتا ہوں اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ کو خوب ہی زور سے ملتا ہوں اندر آنتیں حرکت میں آجاتی ہیں۔ مرے ہوئے ٹشو بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ پھر کنارے پر کھڑے ہو کر تولیئے کی بجائے ہاتھ سے پورا جسم رگڑتا ہوں۔ روم روم جاگ اُٹھتا ہے اور بدن اسکول کی لڑکی کے بدن کی طرح نرم اور چکنا ہو جاتا ہے۔ چونکہ ننگا ہوتا ہوں اور سب کی طرف دیکھتا بھی ہوں، اِس لئے میری طرف کوئی نہیں دیکھتا۔ بندر بھی گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ شاید سمجھتے ہیں کہ ہم سے بھی بڑا کوئی آگیا۔ چنانچہ ننگا ہوتا ہوں اور سب کی طرف دیکھتا ہوں، ایک انسانی کھوپڑی پڑی ہے، جس کے ساتھ ریڑھ کی ہڈی لگی ہے۔ ضرور کسی وِدیا کی بہن یا اس کے بھائی کا جل پروا ہوا ہوگا۔ مجھے اس کا اتنا نہیں لگا جتنا اس بات کا کہ —— ہائیں! ہم ہندوستانیوں کے بھی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے! —— یہ نہیں ہو سکتا کسی اور قوم کا کوئی آ کر یہاں ڈوب مرا ہو —— ایسا ہو تو دنیا جہان میں کہرام مچ جائے اور وہاں کے لوگ رگ لگا کر پوری بالو کو چھان ماریں اور اپنا مردہ نکال لیں۔

اس کھوپڑی سے کچھ پرے ہو کر کنارے پر کپڑے رکھتے ہوئے میں پانی میں اترا تو کیا دیکھتا ہوں کہ پاس ہی کے ایک اجول ادرپاون جل میں ایک مردہ پڑا ہے۔ میں اُچھل کر باہر آگیا اور گھن اور خوف سے کانپتا ہوا مُردے کی طرف دیکھنے لگا جس کا جل پہ واہوا تھا اور اب اسے جل کی پرواہ نہ تھی ــــ اس کے بدن کا گوشت مچھلیاں کھا چکی تھیں۔ اگر میں بھولتا نہیں تو مردے کے بچے ہوئے چہرے پہ ایک طرف داڑھی تھی اور دوسری طرف سب صفاچٹ تھا۔ آج کے تجربے سے میں اس بات کا اندازہ کرتا ہوں کہ مرنے سے پہلے وہ ضرور سنگم پر گیا ہوگا اور وہاں کے کسی لوک پتی، چندر بھان یا کوشک سے حجامت بنوائی ہوگی ــــ خیر میں اپنے کپڑے پکڑ کر دریا کے اوپر کی طرف ہولیا، تاکہ اس غازی مرد کے گھناونے بدن سے لگا ہوا پانی مجھ تک نہ آئے۔ ایک بار پھر کپڑے رکھ کر دریا میں اترا ہی تھا کہ پانی میں سے دو ٹانگیں باہر اٹھتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں بھاگ آیا اور جب سے میں نے دروپدی گھاٹ تو کیا کسی سینا یا ساوتری گھاٹ پہ بھی نہانے کا ارادہ نہیں کیا ــــ اور یہ ودیا، میری بیوی، ایک عجیب طرح کے پاگل پنے میں اپنا جل پہ وا کرنے کو کہہ رہی ہے... نا بابا! میں نہیں چاہتا کہ مرنے کے بعد کسی کی بھی ٹانگیں یوں پانی سے باہر اٹھی ہوں۔

بازار جاتا ہوں تو وہاں ایک مسلمنٹے سے میری لڑائی ہونے لگتی ہے۔

ایک پل میں یوں نظر آنے لگتا ہے جیسے شہر بھر میں ہندو مسلم فساد ہو کر رہیں گے کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ یہ بات نہیں کہ وہ میری طرف دیکھ کر ہنس دیا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی۔ البتہ وہ ایک شعر گنگنا رہا تھا۔

یہ عجیب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

اس نے صرف ایک بار میری طرف دیکھا تھا اور میں نے سمجھا وہ شعر مجھ پہ چپکا رہا ہے۔ میری آدھی منڈھی ہوئی داڑھی کا مذاق اڑا رہا ہے۔ مگر جب وہ اللہ ورسول کی قسمیں کھاتا ہے تب مجھے ماننا ہی پڑتا ہے یہ طے بات ہے کہ وہ یوں ہی اپنے البیلے پن میں شعر پڑھ رہا ہوگا اور میں اپنی نروز کا شکار اسے غلط سمجھ گیا ہوں گا۔

میں دفتر پہنچتا ہوں ۔۔۔ لیٹ! ۔۔۔ اور چپکے سے اپنی سیٹ میں جا دبکتا ہوں۔ یوں کام میں لگ جاتا ہوں جیسے صبح ہی سے مرنے کی فرصت نہیں اور قریب دو گھنٹے سے اس دفتر میں نزع کے عالم میں رہا ہوں۔ دفتر کے کلرک میری طرف دیکھتے ہیں۔ کھل کے ہنستے ہیں اور بار بار میری عیادت کے لئے آتے ہیں۔ اس عرصے میں میرا سیکشن انچارج صرف ایک بار میرے پاس آتا ہے۔ میں بہت کچھ اپنا چہرہ اس سے چھپانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جھی للگ بک کے گم ہو جانے میں جو ہنگامہ بپا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو

بھول کہ مجھے اس کی طرف دیکھنا ہی پڑتا ہے وہ میری طرف دیکھتے ہی کہہ اُٹھتا ہے ۔۔ "آج تم سنگم پہ گئے تھے؟"

"جی، سر" میں جواب دیتا ہوں اور میرا ہاتھ اپنے آپ چہرے کی طرف اُٹھ جاتا ہے۔ میں ڈرتا، لرزتا ہوں کہ نہ معلوم اب وہ مجھے کیا کہے گا؟ لیکن صاحب وہ ایک ایسی بات کہتا ہے کہ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ اس بات سے میری داڑھی کا کیا تعلق؟ وہ کہتا ہے ۔۔ کوئی بات نہیں ۔۔۔ لاگ ٹھیک کل مل جائے گی۔"

اور وہ چلا جاتا ہے۔

مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ چہرہ کانوں تک تمتما اُٹھتا ہے اور اس کے اُن منڈے حصّے پر ایکا ایکی ایک عجیب سی خارش ہونے لگتی ہے۔ میں جتنا اسے کھجاتا ہوں اتنا ہی اوپر سے نیچے تک میری خارش بڑھتی جاتی ہے۔

میں کام کے بیچ سے اُٹھ کر اپنا جی لگانے کے لئے باہر چلا جاتا ہوں۔ کچھ ٹورسٹ آتے ہیں جو میری طرف بالکل نہیں دیکھتے۔ باہر کے لوگوں کا یہی ہوتا ہے تاہم ہم ہندوستانیوں کی طرح دوسرے کے پرائیویٹ معاملوں میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتے۔ ان میں سے ایک بنچ پر میرے پاس آ بیٹھتا ہے، اور اپنا ہینڈ بیگ نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ بظاہر ایک اچٹتی ہوئی نظر مجھ پر ڈالتے اپنا بیگ پکڑ کر اس میں سے آئینہ نکالتے ہوئے اپنا منہ دیکھنے لگتا ہے۔ یعنی میرا نہیں، اپنا منہ ۔۔۔۔

میری سمجھ میں کچھ آتا ہے، کچھ نہیں آتا۔ اگر سویرے، بازار میں اس مسلمنٹے سے میری لڑائی نہ ہوتی تو شاید میں اس گورے کرسٹان سے بھی جھگڑ جاتا۔ شاید میں اس لئے چپ رہا کہ ان گوروں کا اب تک ہم پر بہت رعب ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے، اس کے آئینہ دیکھنے کا میری داڑھی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ میں اس کان فیوزڈ حالت میں، اس کی طرف دیکھ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔

"میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"ضرور... ضرور" وہ کہتا ہے "میرا نام رچرڈ کینیڈی ہے"

اور پھر میرے پوچھے بنا وہ کہے جاتا ہے "میں امریکہ میں کین ٹکی اسٹیٹ سے آیا ہوں۔ میرے شہر کا نام باربرڈل ہے۔"

میں اپنے کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتا ہوں ـــــ سالا آیا بھی ہے تو باربرڈل سے ـــــ یا شاید میری داڑھی کی طرف دیکھ کر اس نے کسی فرضی قصبے کا نام لے لیا۔ بہر حال، میں پھر پوچھتا ہوں۔

"اس وقت آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"بنارس سے... میں سارناتھ میں بدھ کا ستوپ دیکھنے گیا تھا" اور پھر وہ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے "وہاں سے گاڑی میں آیا ہوں اور اب جہاز کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"سٹوپ اچھا لگا آپ کو؟"

"بہت"، وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے "لیکن معلوم ہوتا ہے انڈیا میں لوگ پرانی تاریخی چیزوں کو ٹھیک سے سنبھال کر نہیں رکھتے۔ دیکھو نا اس کے ایک طرف خشک گھاس سی اُگی ہے...."

اس سے پہلے کہ میں اس کی بات پہ ری ایکٹ کروں۔ لاؤڈ اسپیکر پہ سے آواز آتی ہے — "یور اٹینشن پلیز — فلائٹ ٹو او تھری کے پسنجر...."

رچرڈ اپنا بیگ سے اٹھتا ہے۔ وہ فقرہ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ جو مجھ سے رخصت ہوتے، ہاتھ ملاتے مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں بیکار ہی سارناتھ گیا، سٹوپ دیکھنے کے لئے۔"

دفتر میں جیسے تیسے بھی دن کٹتا ہے میں وقت سے پہلے ہی اُٹھ کر چل دیتا ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے کہ چاہے میری پوری جائداد لگ جائے سیلون میں جا کر حجامت بنواؤں گا۔ پھر کوئی دنیا کا اور کام کروں گا۔ جبھی میں اپنے آپ کو یونیورسٹی ہیئر کٹنگ سیلون کے سامنے پاتا ہوں جو گرینڈ ٹرنک روڈ ہونے کی بجائے حلد آباد کے ایک کونے میں ہے سامنے اس نام کا بورڈ لگا ہے اور اس کے نیچے لکھا ہے۔ پروپرائٹر ناصر حسین اندر داخل ہوتے ہی میں ایک ایسی کرسی پہ جا بیٹھتا ہوں، جس میں مجھے مار ... گو ... سکون حاصل ہوتا ہے۔

ناصر حسین میرے پاس آتا ہے اس سے پہلے کہ وہ اپنے ہاتھ کا تولیہ میرے
گلے میں باندھ دے وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔
"کسی اور نے آپ کی شیو شروع کی تھی؟"
"ہاں" میں کہتا ہوں "لوک پتی نے، سنگم پہ... گریٹ آدمی ہے۔"
"کچھ بھی ہو" ناصر حسین آواز میں ایک قطعیت پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے۔
"کتنا بھی گریٹ ہو۔ لیکن بات یہ ہے۔ کسی کے بھی چہرے پہ، کوئی سا بھی
حجام، ایک بار کیسا بھی خط لگا دے، کوئی دوسرا حجام اسے ہاتھ نہیں کر سکتا۔
یہ ہماری یونین کا قانون ہے۔"
"آپ کی یونین کی ایسی تیسی۔" میں ایک دم آگ بگولا ہو کر کہتا ہوں "ایک
طرف ہمارے حاکم ہیں۔ دوسری طرف کامگار، مزدور اور ان کی یونین... بیچ
میں ہم لٹک رہے ہیں... کیا آپ نے کسی بزرگ سے نہیں سنا۔ مرو اور مرنے دو؟
ہم جائیں تو کہاں جائیں؟"
"باہر" ناصر حسین کہتا ہے۔
میں ایک دم سب کچھ بھول کر پہلے باہر کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر اس
بات کے معنی سمجھتا ہوں مجھے امید ہی نہ تھی یونیورسٹی کٹنگ سیلون کا ناصر حسین
آزادی کے بعد میرے ساتھ ایسا سلوک کرے گا۔ ہوش میں آتے ہوتے ناصر حسین
سے کہتا ہوں "میں تمہاری یونین کے خلاف اسٹرائیک کر دوں گا۔ بھوک ہڑتال کر

دوں گا... میں... میں پنڈت جی تک پہنچوں گا، جو یہاں کے رہنے والے ہیں۔ اپنے وطنی ہیں۔ الہ آباد میں ایک بار آنے دیجئے انہیں۔ میں انہیں کہوں گا پنڈت جی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ابھی تک، اس عمر میں آپ نے دیش کا معاملہ ٹھیک نہ کیا تو مجھ سے ہو کر کیا کریں گے؟ "

اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو میں ناصر جبین کے حضور میں گڑ گڑانے لگتا ہوں "ناصر جی! آپ مجھ سے سو روپے... دس بیس روپے لے لیجئے لیکن بھگوان ـــ نہیں نہیں، اللہ کے لئے ایک بار میری حجامت کر دیجئے نہیں تو میں دنیا جہان میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا... سب مجھ پر ہنس رہے ہیں... ایک میں رو رہا ہوں۔"

بجائے اس کے کہ ناصر جبین میری حالت پر رحم کھاتے، وہ کہتا ہے "رات ہو گئی۔ اس وقت کون منہ دیکھتا ہے؟"

بیکار ہے۔ سب کچھ بیکار ہے۔ چنانچہ میں کوئی فرضی چھڑی اٹھا کر فرضی ہوا میں اسے گھماتا ہوا، کسی فرضی گھر کی طرف چل دیتا ہوں....

رات بھر وٹیا، میری بیوی میرے پاس نہیں آتی مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں کوئی کبوتر ہوں جسے کسی نے لال رنگ لگا دیا۔ یا چڑا ہوں جس کے گلے میں کسی نے پھندنا باندھ دیا ہو۔ اور اب میرے ہی عزیز مجھے، اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیتے۔ چونچیں مار مار کر لہولہان کر رہے ہیں، کاٹ کاٹ کر

بھگا دینے کی کوشش میں ہیں۔

تڑکے ہی اُٹھ کر میں سنگم کی طرف چل دیتا ہوں اور لوک پتی کے پاس پہنچ کر ہاتھ جوڑ دیتا ہوں "ہے، لوک پتی! .... بھگوان کے لئے میری حجامت بنا دو۔ تم نے کب سے مجھے اس حالت میں لٹکا رکھا ہے، نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں .... حالانکہ میں نے تمہیں پورا ٹیکس دیا ہے"

لوک پتی جس نے کسی کے چہرے پر کچھ خط لگا رکھے تھے، اسے چھوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے "آپ ذرا ٹھہرئیے، شریمان ــــ"

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ آدمی احتجاج کرتا ہے "مجھے دکان پر جانا ہے۔"

"سبھوں کو جانا ہے بھیّا" لوک پتی کہتا ہے "سبھوں کو جانا ہے..... کل ان کی حجامت بیچ ہی میں رہ گئی تھی"

"یہ جائیں بھاڑ میں، اور تم جاؤ جہنم میں،" وہ آدمی منہ پر کف لاتے ہوئے کہتا ہے۔ "ان کی تو کل کی حجامت رہ گئی۔ میں پچھلے اتوار سے اَن منڈا بیٹھا ہوں"

معلوم ہوتا ہے اس آدمی کی برداشت آخری حد تک پہنچ گئی ہے اور وہ لوک پتی کو مارے گا لیکن لوک پتی کی ایک ہی کڑی نظر اور ہاتھ میں اُسترا دیکھ کر وہ کہتا ہے ــــ "اچھا ــــ منّ بھولبو، ان کے بعد میری باری ہے۔"

اور میں اطمینان سے لوک پتی کے ہاتھ میں اپنا گلا دے دیتا ہوں اور سوچتا ہوں کچھ بھی ہو، لوک پتی آدمی بڑا نہیں۔ معاملے کا بہت کھرا ہے۔۔۔

تھوڑی ہی دیر میں چہرے کا وہ حصّہ صاف ہو جاتا ہے جو کل ان کٹا رہ گیا تھا۔ میں اس پہ ہاتھ پھیرتا ہوں۔ کیا جرنیلی سڑک، بلکہ آٹو باہن کی طرح سے صاف ہے جس پہ کوئی سو میل کی رفتار سے گاڑی چلا سکتا ہے۔ جبھی لوک پتی مجھ سے کہتا ہے "اب آپ اُٹھ جائیے"

"کیا مطلب؟" میں آخری بار حیران ہو کر پوچھتا ہوں۔

"جو اَن کٹا رہ گیا تھا، وہ میں نے کاٹ دیا۔"

"مگر" میں چہرے کے دوسرے حصّے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا ہوں "رات میں ادھر بھی تو بال اُگ آئے ہیں ــــ؟ ــــ ا ــــ !ا!"

"کٹ جائیں گے بابو!۔۔۔ وہ بھی کٹ جائیں گے" لوک پتی سلی پہ استرا تیز کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"باری سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور میں ڈائیک پہ کھڑا اپنی باری کا انتظار کرنے لگتا ہوں جو آئے گی، پر نہیں آئے گی۔ کوشک بلند آواز سے اپنی فتح مندی پہ ہنس رہا ہے۔ چندن بھان نہ معلوم کس کو دیکھ کر ایکٹرس جمنا کا وہ شعر پڑھنے لگتا ہے جو اس نے فلم "دیوداس" میں بولا تھا۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

سامنے دریا میں عورتیں نہا رہی ہیں۔ ایک دوشیزہ نے ہر قسم کی شرم و حیا سے بے نیاز ہو کر سب کپڑے اتار دیئے اور زور سے انہیں دُور، کناروں کی طرف پھینک دیا۔ اور پورے پر تول کر پانی میں کود گئی۔ جتنے زور سے اس نے چھلانگ لگائی اتنے ہی زور سے پانی اسے پٹخنے کو آیا۔ اس حسین ڈائیونگ کے بعد ابھی وہ سطح پر نہیں آئی ہے معلوم ہوتا ہے، نیچے سرسوتی تھاہ لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جاتری لوگ نہ معلوم کیوں ایکا ایکی چوکس ہو گئے اور اب پانڈوں کے پھول نہیں بکتے۔ وہ ٹوکریاں ہاتھ میں لئے سب کی طرف بٹر بٹر دیکھ رہے ہیں۔

قلعہ جسے شہنشاہ اکبر نے بنوایا تھا ایک منی ایچر ہو گیا جو وقت کے عجائب گھر میں پڑا ہے۔ مندر زمین میں دھنس چکے ہیں۔ اور بتدریج شاید او پر چاند، شکر اور منگل پر کود گئے، جو اب ہماری دھرتی کے صوبے ہو چکے ہیں ....

ایک فقیر جو شکل سے حکیم وقت معلوم ہوتا ہے، بددُعا دیتا ہے، جو مجھے دُعا معلوم ہوتی ہے۔

"جا بچہ! اسپیفٹی کے سوا تیرا کوئی دارو نہیں۔"

اور میں خوشی خوشی گھر لوٹ جاتا ہوں، جس کا راستہ بازار میں سے ہو کر جاتا ہے۔

جیون پرست

میرے جھونپڑے کے باہر، سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا گڑھا ہے جسے گزشتہ ہفتے کی رات کو بارش نے بھر دیا ہے، بالکل ایک چھوٹے سے دل کی طرح جس میں جذبات کے مد و جزر پیدا ہوتے ہیں، اس گدلے پانی والے گڑھے میں بھی لہریں اٹھتی ہیں اپنے محدود ساحلوں سے ٹکراتی ہیں فنا ہو جاتی ہیں۔

کبھی کبھی میں اپنے گھر کے پاس بانسوں کے ایک ٹھنڈ پہ پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں اور اس گڑھے میں ملیریا کے جراثیم سے بھرے ہوئے گندے پانی کو بڑے غور سے دیکھتا ہوں اسے ہلا کر اس میں کیچڑ کے بادل پیدا کرتا ہوں اور دال بگھارتی ہوئی عزیزہ کو آواز دے کر کہتا ہوں، عزیزہ اگر یہ گڑھا ایک خوبصورت جھیل ہوتا تو کیا ہوتا۔۔؟

عزیزہ حسبِ معمول ایک سوکھی سی ہنسی ہنستے ہوتے میری بات کو دہرانے ہی پر اکتفا کرتی ہے اور میں سوچتا ہوں اگر یہ گڑھا نیلے پانی کی ایک خوبصورت جھیل ہوتا، تب بھی شاید عزیزہ کے دل کی دھڑکن ویسے کی ویسی رہتی ... لیکن اس کے باوجود جھیل کا خیال آتے ہی میرے دل کا تمام، جراثیم سے پٹا ہوا گدلا پانی متحرک ہو جاتا ہے اور میں جذبات کے ڈونگے پر بیٹھا ہوا پانی میں بہت دور نکل جاتا ہوں۔ غالباً چاندنی رات ہوتی ہے اور میں وحشیانہ انداز سے گاتا ہوں اومری چاندنی راتوں کے خدا... اس وقت مجھ پر لی پو کی سی مجوبانہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اور میں خوشی اور روشنی کے ہر پرتو کو خوشی اور روشنی سمجھ کر جھیل کے وسیع پانیوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ کاشمیری ڈل کے وہ تمام نظارے میرے ذہن میں پیدا ہو جاتے ہیں جو میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ البتہ ہر سال دیکھنے کا تہیّہ کرتا ہوں۔ لیکن یا تو سرکاری حکم کی تعمیل میں بندوقوں والی بارکوں کا ٹھیکہ ختم کرنا ہوتا ہے اور یا میرا مختصر سا اثاثہ عزیزہ کی دھڑکن کے علاج میں ختم ہو جاتا ہے۔

•

بارش کے بعد چوماسا ہوتا ہے اور چوماسے کے بعد بارش، بارش چوماسے کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور چوماسا بارش کا پیش خیمہ، حتّٰی کہ یہ دونوں شوریدہ سر نیچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گھر سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور اس کے بعد جوہڑ رہ جاتی ہے اور نام اللہ کا۔ کچھ دن تک تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ نام اللہ کا

بھی نہیں رہا۔ دھوپ ہی دھوپ رہ گئی ہے اور اس عالم میں بھورا ایکس ملّا چاچا، پریتم داس آنریری مجسٹریٹ اور چھپر کھٹ کے پنیدے میں لگی ہوئی عزیزہ کسی کو توقع نہیں ہوتی کہ ذخیرے کے پیپل اور لسوڑے مل کر تالیاں بجائیں اور نہ ہی کسی کو شیشم کے گرتے ہوئے پتوں کے لئے نوحے کی توقع ہوتی ہے۔ نباتات چرند پرند، خاموش، انسان وحیوان خاموش کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے قدرت کے ممتحن نے ان سے کوئی نصاب سے خارج سوال پوچھ لیا اس وقت پریتم داس کا ہیبت ناک ڈنگر (کتا) اور میں دونوں زبانیں باہر نکالے ہوئے اس گڑھے کی طرف رجوع کرتے ہیں... گڑھے میں بارش نہیں اس کی حسین یاد باقی رہ جاتی ہے جسے دیکھ کر یہ بہشتی خیال آتا ہے — کبھی بارش ہوتی تھی، کبھی بارش ہوگی!

ایک شام بارکوں کے لئے پھوس لدوا چکنے کے بعد جب میں اس گڑھے کے قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ گڑھے کے پانی میں سینکڑوں چھوٹے چھوٹے دمدار مینڈک اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تیر رہے تھے اور گڑھے کے ساحلوں پر لاتعداد لاروے چمٹے ہوئے تھے۔ کبھی کوئی لاروا ایک لحنت اپنے سمندر کے ساحل کو چھوڑ دیتا اور لاپروایانہ، کھلنڈرے پن سے اپنی دم کو سر کے ساتھ لگاتا چھوٹا ہوا بہت دور تک پانی میں نکل جاتا اور گڑھے کی تہ میں اُگی ہوئی نباتات میں بسنے والے کرنگوں کے درمیان میں سے ہوتا ہوا پھر اپنے ٹھکانے کو لوٹ آتا۔ دملار مینڈک ان ننھے ننھے جابجوں کی طرح بے ڈھنگے انداز سے قلابازیاں کھاتے ہوئے

کبھی سطح پہ چلے آتے اور کبھی تہہ میں بیٹھ جاتے میں نے اسی ٹھنڈ پہ کھڑے ہو کر ان مچھلیوں کی ناقابل فہم حرکتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ آخر کیا چیز انہیں بظاہر بے مقصد اور بے معنی طور پر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تیرنے کے لئے مجبور کرتی ہے؟ کونسے ریاستی رازوں کو سینے میں لئے، کونسی سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے یہ اپنی بستی کو چھوڑتے ہیں، پھر لوٹ آتے ہیں؟ پھر خیال آتا ہے شاید یہ لاروے، یہ جراثیم، یہ دمدار مینڈک پراگندہ خیالات ہیں جو گھڑے کے دل میں اُٹھتے ہیں جیسے کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے خیال آتا ہے کہ کل ڈھولن کی بڑھیا بڑھیری طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اپنی انگلیوں سے سامنے کے قصاب خانے کی دیوار پر کوئی نشان بناتی تھی ... جی ہاں اس قسم کا خیال بھی تو ایک لاروا، ایک دمدار مینڈک ہی تو ہوتا ہے جو اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز سے تیرنے کے لئے دل کے ساحل کو چھوڑ دیتا ہے اور پانی میں بہت دور، موٹے اور فضول نباتات کے آبی مرغزار میں ہوتا ہوا پانی کی سطح پر نمودار ہوتا ہے اس کے بعد حبیب یاد آتا ہے کہ ننھے بھورے سائیس نے میری گزشتہ ماہ کی اٹھنی مار لی ہے تو میں اسے نقصان پہنچانے کے ہزاروں منصوبے گانٹھتا ہوں لیکن محسوس کرتا ہوں کہ یہ خیال بھی ایک مچھلی سا ہے جو کہ تیرتا ہوا دور پانی میں نکل جاتا ہے لیکن پھر ساحل کو آچمٹتا ہے گویا ساحل اس کے لئے محض ایک منزل نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے بالکل ایک ایسی حقیقت ہے جیسے میرے منہ پر خشخشی داڑھی ہے اور میں اچھی طرح

سے جانتا ہوں کہ اس داڑھی کو دیکھ کر ڈھولن کی بڑی بٹو کبھی پسیج نہیں سکتی کبھی قصاب خانے کی دیوار پر اپنی انگلیوں سے نشان نہیں بنا سکتی۔ ایسے ہی جیسے میرا تمام اثاثہ عزیزہ کی ایک فضول دیرینہ بیماری پہ ختم ہو چکا ہے اور اسی وجہ سے میں کشمیر دیکھنے کے ناپاک ارادے کو دماغ میں گھسنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے گڑھے میں اور کثافت پیدا ہوتی گئی اور اس میں مزید انڈے اور لاروے پیدا ہوتے گئے۔ مجھے ان بدزیب بے ڈول، نامکمل بچوں سے ایک قسم کا انس پیدا ہو گیا تھا۔ میں ان کے لئے اپنے دل کے کسی کونے میں محبت کا جذبہ پانے لگا ——— ایسا ہی محبت کا جذبہ جو میرے دل میں اپنے بڑے بیٹے فخرو کے لئے پیدا ہوتا ہے یا اپنی شیر خوار بچی خالدہ کے لئے.. اس گڑھے میں ملیریا کے خطرناک جراثیم پل رہے تھے۔ لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ نہ صرف آنریری مجسٹریٹ اور ننھے بھورے کو ملیریا ہو جائے بلکہ مجھے، عزیزہ اور میرے سب بچوں کو یہ بیماری لاحق ہو۔

مجھے ان لاروؤں سے ایسے ہی انس تھا جیسے کہ مجھے اپنے پراگندہ خیالات سے محبت تھی جب کبھی صبح کو ٹھنڈی ہوا چلتی ہے تو میں چارپائی پر لیٹا ہوا اپنے پراگندہ خیالات کی مدد سے دنیائے حقیقت کے تمام ناممکنات کو ممکنات سے ہمکنار کر دیتا ہوں۔ مثلاً سوچتا ہوں کہ ٹھیکے کے سامنے کوٹھی میں بسنے والے

سیمنٹ کے بادشاہ کی نوجوان لڑکی خود بخود میرے پاس چلی آتی ہے۔۔۔۔
یا آج میں نے بڑے سردار صاحب کی جیبوں سے نوٹوں کے تمام بنڈل اچک
لئے ہیں اور عزیزہ کو ساتھ لئے ایک کار میں بیٹھا کشمیر کی طرف بھاگا جا رہا ہوں۔
اب کشمیر کے نشاط باغ میں ہوں میں اور عزیزہ بڑے بڑے سرخ سیب
جو کہ ڈاکٹر نے اس کے لئے مفید بتلائے ہیں، کھا رہے ہیں۔ ہماری ٹانگیں پانی میں
ہیں اور بہ فانی پانی ہمارے پاؤں کو چھوتا ہوا دور کسی نامعلوم جگہ کی طرف
جا رہا ہے اور جس طرح میں اپنے دل کو من مانی کارروائیاں کرنے کے لئے کھلا
چھوڑ دیتا ہوں اسی طرح اس گڑھے میں لاروؤں کو تیرنے سے کوئی نہیں
روک سکتا۔

اب جب کہ گڑھے کا پانی سوکھتا جا رہا تھا میں سوچنے لگا ان ننھے ننھے چابکوں
اور ان تدبیر مینڈکوں کا کیا ہوگا۔

ایک دن گڑھے کا پانی سوکھ جانے سے یہ سب ختم ہو جائیں گے جیسے
میرے دل کی آبیاری نہیں ہوتی کیا اس گڑھے کی آبیاری بھی نہ ہوگی؟ میں
ہر روز آسمان کے کسی کونے میں لٹکتے ہوئے بادل کو دیکھا کہ تا کبھی ایسا بھی
ہوتا ہے کہ ایک معمولی سا بادل بادلوں کی ایک فوج کے ہراول میں آتا ہے۔۔
لیکن اس دن کیپٹن کا داروغہ اس گڑھے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں نے قریب
پڑے ہوئے کینیر کے پتوں سے اس گڑھے کو ڈھانپنے کی کوشش کی لیکن

مکھی کی طرح صفائی کا داروغہ بھی طبعی طور پر غلاظت کے تمام اڈوں سے واقف ہوتا ہے اور اس داروغہ کو بھی اس گڑھے کا علم تھا اس کے ساتھ راموکمائی ایک خاکروب دو نوجوان، نو ملازم ہیلتھ وزیٹر.. انسانی تہذیب کے لاروے بھی آ رہے تھے وہ لوگ اس گڑھے میں لال دوائی پھینک کر تمام جراثیم ہلاک کرنا چاہتے تھے میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ میرے فخر کو مار ڈالنا چاہتے ہو، میری خالدہ کو زہر دینے آئے ہو.... لاؤ تمہارا کام میں آسان کئے دیتا ہوں۔ میں بلبر پلا کے تمام اڈوں سے واقف ہوں اور ریختہ پل کے برقعے میں جراثیم کو تباہ کرنے میں مجھ سے زیادہ کوئی بھی آپ کا ممدومعاون ثابت نہ ہوگا۔

نوجوان ہیلتھ وزیٹر نے پرشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بالآخر اس نے تمام دوائی میرے ہاتھ میں دے دی کہ ہر روز صبح اُٹھتے ہی اسے تمام گڑھوں میں پھینک کر ان لاروں کا خاتمہ کر دیا کروں۔ میں نے ان سب کو یقین دلایا جس کے بعد وہ چلے گئے اور میں نے وہ لال دوائی واٹر ورکس کی بیس ہزار گیلن والی ٹینکی میں پھینکوا دی۔

میں حسب دستور ہر ہیکے کی طرف سے آنے والی سڑک کے پاس پل پر ٹانگیں لٹکائے اس گڑھے کے قریب بیٹھا تھا اور مجھ پر سے سرپہ سُرتلی تابئں الاپتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ میں نہیں جانتا وہ بے بضاعت پتنے اپنی بھاشا

میں گیا اور کونسا راگ الاپ رہے تھے، شاید وہ کہہ رہے تھے اے اللہ کے نیک بندے! تونے ہماری اولاد کی خبرگیری کی ہے۔ ہم تیری اولاد کی خبر گیری کریں گے اور انہیں جلد ہی اس دنیا کے جیل خانے سے نجات حاصل کرا دیں گے یعنی ملیریا کے سب سے زیادہ تندرست جراثیم فخرو اور خالدہ کے جسم میں داخل کریں گے میں نے جواباً کہا اے میرے عزیز مچھرو! میں نے تمہاری اولاد کو بچا کر تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ ایک معمولی انسانی فرض ادا کیا ہے۔

گرمیوں کے شروع میں چھاؤنی کے ہیڈ کوارٹر ڈلہوزی جا چکے تھے اور انگریزی رجمنٹ کے بھی نصف سے زیادہ سپاہی ڈگشائی اور لونڈوپا پہنچ گئے تھے ان دنوں ننھے بھورے کا بے کار ٹٹو سارا دن تھان پہ بندھا رہتا اور ہر روز دوپہر ایک بجے کے قریب زور زور سے ہنہنایا کرتا شاید وہ اس ایذا رساں بندے والے جوتے کو یاد کرتا تھا جو کہ چند دنوں سے اس کے کندھے پر نہیں ڈالا گیا تھا۔ ننھے بھورے کا ٹٹو ان بیکاری کے دنوں میں یا تو کثرت سے پیشاب کیا کرتا یا اپنی پچھاڑی سے لید کو چاروں طرف بکھیر دیتا۔ اس کے علاوہ اسے عزیزہ کی دونوں بکریوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان بکریوں کے نام گنگی اور جمنی تھے اور انہیں عزیزہ غازی آباد سے جہیز میں لائی تھی۔ جب گنگی اور جمنی اپنے گلے کے گھنگروؤں کو بجاتی ہوئی سبک رفتاری کے ساتھ اس کے پاس سے گزرتیں تو وہ اپنی ٹانگوں کو ہوا میں اچھالنے لگتا اور رسہ تڑانے لگتا

وہ اپنے جسم کو گزند پہنچانے والی مکھیوں کی بجائے بے ضرر بکریوں کو اپنا دشمن سمجھ لیتا۔ ٹانگیں ہوا میں اچھالنے سے بکھری ہوئی لید میں بسنے والے تمام مچھر اڑنے لگتے اور گیبرڈ خاکروب ان مچھروں کو بھگانے کے لئے فوراً ملتا اور شیشم کے سوکھے ہوئے پتوں میں آگ لگا کر گہرا دھواں پیدا کر دیتا پیشاب اور لید کے تعفن مچھروں کی گھوں گھوں اور دھوئیں کی کثافت سے عزیزہ کا دل اور بھی ڈوبنے لگا۔

جب بارش کے خدا نے میری عرضداشت مسترد کر دی اور گڑھا زیادہ سوکھ گیا تو میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی میں نے بچاسی بنگلہ کے مالی سے گینتی مانگی اور ننھے بھورے کے ٹٹو کی ناند سے لے کر اس گڑھے تک ایک نالی بنائی اور صاف اور تازہ پانی کو نالی میں انڈیل دیا... گڑھا پھر لبالب بھر گیا بس پھر شام کو تاڑی لے کر گڑھے کے پاس جا بیٹھا اور کھانستے ہوئے ان کی تمام نقل و حرکت کا اندازہ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ اس تازہ اور شفاف پانی نے ایک ہی دن میں لاروے کو اتنا کمزور کر دیا ہے کہ وہ ڈھاب کے کناروں سے جدا نہیں ہوتے اور نہ ہی ان میں وہ پہلی سی چستی اور کھلنڈرا پن رہا ہے۔

ان دنوں آنریری مجسٹریٹ کشمیر جا رہا تھا اور اس کی چھوٹی بیوی، عزیزہ کو بطور رفیقہ کے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ میں حقیقت حال سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ عزیزہ کو بطور خادمہ کے ساتھ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن میں اس بات

کے لئے فوراً رضامند ہوگیا۔ محض اسی وجہ سے کہ وہ خواب جن کی تکمیل میں ابھی تک اپنی زندگی میں نہیں دیکھ سکا۔ اپنی عزیزہ کی زندگی میں پورے ہوتے ہوتے دیکھ لوں اس کے علاوہ خنک ہوا اور مصفا پانی میسر آنے سے عزیزہ کی صحت بھی اچھی ہو جائے گی صرف راستے کے اونچ نیچ کی وجہ سے اس کا دل ڈوبنے کا احتمال تھا لیکن مجسٹریٹ کی اپنی کار تھی مجھے یقین دلا یا گیا کہ وہ لوگ اسے بڑے آرام سے کشمیر لے جائیں گے میں نے ایک نامکمل سی خوشی میں گنگی اور جمنی دونوں کو بیچ دیا اور ان پیسوں سے عزیزہ کے لئے کچھ کپڑے لئے اور ایک کمبل خرید لیا اور ان لوگوں کے ساتھ اسے کشمیر روانہ کر دیا۔

مجھ جیسے لوگ جو اپنے تخیل کی مدد سے کثیف گڑھوں میں ہی خوبصورت جھیلیں دیکھ لیتے ہیں، قدرت بھی انہیں کثیف گڑھوں سے پرے جانے کی طاقت نہیں بخشتی۔۔۔ اس وقت جب کہ عزیزہ کشمیر کی ٹھنڈی ہوا کھا رہی ہوگی۔ میں اس گڑھے کے قریب بیٹھا ہوں گا۔ کام کے وقت کا بیشتر حصہ اس گڑھے کے پاس ہی گزرتا تھا۔ لیکن صاف پانی کی وجہ سے پہلے جھلبجے مر چکے تھے۔ پچاسی بنگلے کے مالی نے مجھے بتایا کہ پانی کے باسی اور گسے اور کیڑے پیدا ہو جائیں گے اور وہ دار مینڈکوں میں بھی وہی پہلی سی چپ" ممود کر آئے گی ننھے بھورے کے ٹٹو کا پیشاب بھی اسی نالے کے راستے سے گڑھے میں آنے لگا۔

اور ایک دن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب کہ میں نے پھر مینڈکوں لاروؤں کو پانی میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے مخصوص بےڈھنگے انداز سے تیرتے ہوئے دیکھا۔ پانی کے باسی اور پیشاب وغیرہ کی وجہ سے گندے ہو جانے سے گڑھے میں پھر ایک بار رونق پیدا ہو گئی اور میں ایک گونہ مطمئن، کھاٹ پر لیٹے لیٹے زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔

دھوپ اتنی تیز ہو چکی تھی اور چوماسا اس آفت کا تھا کہ پل کے اردگرد کا سارا رقبہ کھمبوں سے بھر گیا لیکن اس دن سے میں نے کبھی آسمان کی طرف بارش کے لئے نہیں دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ آسمان سے تازہ پانی پڑتے ہی یہ کیڑے ہلاک ہو جائیں گے اور جب تک یہ پانی پھر کثافت سے آلود اور باسی نہ ہو گا مزید لاروے وجود میں نہیں آئیں گے۔

بچوماسا کے دوسرے دن بڑی موسلا دھار بارش ہوتی اس وقت میں تن تنہا اپنی جھونپڑی میں بیٹھا، اپنا پھٹا ہوا پاجامہ سی رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لالہ کا دو ماہ کا بل کیسے ادا ہو گا کہ باہر کسی نے دروازے پر دستک دی میں نے فوراً اُٹھ کر دروازہ کھولا میرے سامنے تار کا ہرکارہ تھا۔ عمر تیس ۳۵ برس کے قریب ہو گی چہرے کے سیاہ رنگ میں سے دو سُرخ ڈوروں سے بھری ہوتی آنکھیں جھپٹ ہوتی تھیں۔ اس کی خاکی وردی تمام بارش میں بھیگ چکی تھی اور پانی کے قطرے اس کی کنپٹیوں سے ہوتے ہوتے داڑھی کے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپک

رہے تھے ایک انگلی سے چہرہ پونچھنے کے بعد اس نے خاکی بلوز کے نیچے سے ایک بھیگا ہوا لفافہ نکالا اور بولا "میاں عزیزالدین ٹھیکیدار کے مختار آپ ہیں؟"

میں نے بغیر جواب دیئے اس بھیگے ہوئے لفافے کو ہاتھ میں لے کر کھولا تار پریتم داس کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا عزیزہ کو پہاڑ کا تندرست پانی راس نہ آیا اسے کل ہل ڈائریا (پہاڑتی پیچس) کی شکایت ہوئی اور آج اچانک صبح کے سات بجے وہ مرگئی چونکہ تمہارا ایک دن میں پہنچنا مشکل ہے اسلئے میں ڈاکٹر کی سند لے کر اسے دفنا رہا ہوں اپنی رضامندی بذریعہ تار بھیجو۔

میرے دماغ نے اس حادثے کی اطلاع کو قبول نہ کیا۔ میں نے فقط دروازے تک پہنچتے ہوئے اتنا کہا "اے خدا تو اپنی بارش کو تھام لے"

شکار

یہ شروع سردیوں کی بات ہے۔ میں فیروزپور کے قریب مویشیوں کے ایک ہسپتال میں سلوتری تھا۔ ان دنوں دیہات کی خودرو بیریوں پر بور پیدا ہو چکا تھا اور ہسپتال کے ارد گرد کئی فرلانگ تک اُگی ہوتی جھاڑیوں پر پیلی پیلی داڑھیاں لٹکنے لگی تھیں۔ قریب کے جھنڈ اور کیکر بھی اس زرد جال سے محفوظ نہ تھے گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ داڑھیاں ہرے بھرے درختوں کا کوڑھ ہوتی ہیں اور ان کے پتوں ٹہنیوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر نشو و نما سے روک دیتی ہیں لیکن کیکر اور جھنڈ کے کوڑھی ہونے کا افسوس اسے ہوگا جو ان درختوں پر سے کسی میٹھے پھل کا متوقع ہو اس قسم کے درختوں پر تو وہ زرد کوڑھ جس کا نام امربیل بھی ہے پھل کر عجیب بہار دیتا ہے۔

میرے پاس میرا نائب سنگی بیٹھا تھا نائب ہونے کے علاوہ میرا دوست بھی تھا دیہات میں شہر کی سی عجبت تو میسر نہیں آتی اس لئے سنگی ایسے بدمذاق گنوار سے لوگوں پر ہی اکتفا ہوتی ہے سنگی خود دو بیلوں کو اوسر کرتے تنگ آچکا تھا میں نے اسے مخاطب کرتے ہوتے کہا۔

"آج کل چاندنی راتیں ہیں اور یہی دن ہیں جب گنڈا سنگھ والے کی رکھ میں سے نیلا نکل کر ستلج کے کنارے چلا آتا ہے اور درختوں کے جھنڈ میں سے صاف دکھائی دیتا ہے اس کا شکار بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے کیوں کیا خیال ہے تمہارا ــــــ"

سنگی تو گویا پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا میری تجویز کو بے حد پسند کرتے ہوتے وہ اچھل پڑا اور بولا "بہت اچھی رہی ڈاکٹر ــــ ہاتھ دو ڈاکٹر شکار کے ساتھ میرا دوسرا کام بھی ہو جائے گا۔"

میں سنگی کا مطلب نہ سمجھ سکا خود غرض انسانوں کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ سنگی کو شرمساری سے بچانے کے لئے میں نے سردی کے باوجود اپنا ہاتھ جیب سے نکالا اور سنگی کے بڑھے ہوتے ہاتھوں میں دیتے ہوتے بولا۔ دوسرا کام۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"یہی نا" سنگی نے اپنی آنکھوں کو عادتاً جھپکتے ہوتے کہا "دو چار پانچ دن میں شکار بھی اچھا ہو جائے گا اور جو تیل کی پیٹی پرچ رہی ہے اسے بھی

قریب کے کسی گاؤں میں بیچ ڈالوں گا۔ گاؤں کے لوگ چنبیلی کے تیل کو بہت پسند کرتے ہیں۔“ میں نے خفا ہوتے ہوئے کہا ”نہیں تیل ہی کی پڑی رہتی ہے اس دن ڈپٹی صاحب کی آمد کے سلسلے میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں بھی تم نے تیل کی اشتہار بازی شروع کر دی دیکھو یہ کتنی بڑی بات ہے اور پھر سرکاری ملازم ہو کر — لیکن دیہات میں۔ خیر ــ چلو اپنا تیل بھی ــ !“

اسی دن سنگھی نے بندوق میں پل تھرو ڈالنا شروع کیا اور صبح سے پہلے پہلے بندوق صاف کر ڈالی اور پیٹی میں کارتوس بھر لئے سنگھی نے نئے خاکی کپڑے پہنے اور ان پر ایک بوسیدہ سا ادھ سیا بٹونگ اوڑھ لیا۔ یہ بٹونگ سنگھی کے باپ کو شاید افغانستان کی تیسری لڑائی میں ملا تھا جسے دادا، باپ اور پھر پوتا تینوں استعمال کر نے آئے تھے اور غالباً سنگھی کو اسے اپنے بیٹوں کے لئے چھوڑنے کا چنداں خیال نہ تھا میں نے بھی خاکی پہن جس پہن ڈالی اس کے علاوہ میرے پاس ایک نفیس کلاہ تھا جس کے ساتھ میں ایک طرے دار پگڑی باندھا کرتا اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ دیہات کے سادہ لوح لوگ مجھے عموماً تھانیدار یا مال افسر سمجھتے تھے گاؤں کے پرائمری اسکولوں میں ہمیں اکثر چارپائیاں مل جاتیں، جن پر طلباء کے گھروں سے منگوائی ہوئی سوتی یا کھدر کی چادریں بھی ہوتی تھیں۔ سفید پوش نمبردار تک اس بڑے طرے سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے اور ہمیں رکھ سے ویسے ہی مرغیاں بھنی ہوئی ملنی شروع ہو

جاتیں اب بھی جب ان مرغیوں کا خیال آتا ہے تو منہ میں پانی بھر آتا ہے۔

گنڈا سنگھ والا ہمارے قصبے سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہوگا ہم ایک ٹم ٹم کے ذریعے وہاں پہنچ گئے اور جو شو نمبر دار کے ہاں ٹھہر گئے پہلے روز ہی ہمیں شکار سے بہت مایوسی ہوئی ایک دو مرغابیوں کے سوا اور کچھ بھی ہاتھ نہ لگا شب بھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے رہنے کے باوجود کوئی بنیلا ستلج کے کنارے آتا دکھائی نہ دیا اور اگلے روز فرصت پاکر سنگی نے اپنا تیل بیچنا شروع کر دیا۔

مجھے سنگی کی یہ حرکت بہت بری معلوم ہوئی لیکن دوستی اور رفاقت کی وجہ سے اپنے بہت سے ذاتی رجحانات، پسند و ناپسند کو خیر باد کہہ دینا ہوتا ہے میں خاموش ہو رہا لیکن ایک بات جو مجھ پر شاق گزری وہ یہ تھی کہ سنگی کا تیل خالص نہ تھا بالکل وائٹ آئل تھا جسے صاف کر کے اس میں چنبیلی کی خوشبو ڈالی گئی تھی اور اس پر روغن چنبیلی درجہ اول کے لیبل لگا دیئے گئے تھے۔ بوتل پر ہلکا سا مومی کاغذ چڑھا جانے سے یوں بھی اس کی شان دوبالا ہو گئی تھی اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پاؤ بھر تیل کی قیمت بوتل سمیت چھ آنے تھی۔

گنڈا سنگھ والا میں ایک کولھو تھا جس کا مالک ایک ساٹھ سالہ کا بوڑھا جاٹ اللہ داد تھا، اس کی داڑھی لمبی تھی اور اکثر چلتے وقت ہوا سے دونوں شانوں

پر بکھر جاتی اللہ داد کی لاپرواہی کی وجہ سے وہ زردی مائل ہو گئی تھی دور سے اللہ داد یوں دکھائی دیتا تھا جیسے خیڈ کا کوئی بڑا سا درخت ہوا اور اس پر پیلی پیلی امر بیل پھیل گئی ہو اور میں آج تک امر بیل کی خوبصورتی اور داڑھی کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

اللہ داد اندھا تھا۔ بچپن ہیں اس کے لئے جست کے پھولوں کی بجائے کوئی اور ہی چیز اللہ داد کی آنکھوں میں ڈال کر اسے ہمیشہ کے لئے بینائی سے محروم کر دیا تھا اللہ داد کے کولہو کا کچی گھانی کا تیل دور دور تک مشہور تھا۔ اس بات کا اسے بہت غرور تھا وہ جو شو نمبردار پیلا سنگھ ذیلدار اور گاؤں کے برانچ پوسٹ ماسٹر کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اس لئے ڈاک خانہ والوں نے فیروزپور اور بھٹنڈے سے آئے ہوئے تیل کے آرڈر عداًرد کر دیئے تھے اور جو شو نمبر دار نے اللہ داد کے چھوٹے بھائی کے پنشن کے کاغذوں پر تصدیق ثبت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ عدالتوں کے پیادے اللہ داد کے دیوانی مقدموں کے سمن کی تعمیل کئے بغیر شہر کو واپس چلے جاتے شاید یہ اللہ داد کے غرور کی وجہ سے ہی تھا کہ اس نے اپنے بزرگوں کے مزار پر دیا جلانا بھی چھوڑ دیا تھا اللہ داد کو دو ہی باتوں پر ناز تھا ایک کچی گھانی کے تیل پر اور دوسرا اپنی بیوی نیکاں کی پاکبازی پر۔ نیکاں دراصل ارائیں عورت تھی جسے اس کے باپ نے افلاس سے تنگ آکر اللہ داد کے ہاتھ ایک سو پندرہ روپے اور ایک

دیکھ کے عوض بیچ ڈالا تھا، وہ نہ اندھے کو کون لڑکی دیتا ہے اب اللہ داد کے پاس ایک کمادیتین سرسوں کے کھیت، کچھ زمین اور ایک تو منہ عورت تھی اس لئے وہ رہٹ کی گاڑی پہ بیٹھا بڑے اطمینان سے وارث شاہ گا تا

چھلے ہتھے ہتھ تے پیر پھٹے
سانوں واہی دا کم نہ آوندا ای

تیلی اور نیکاں پہ ناز تھا بھی بالکل بجا۔ فیروز پور سے پہلوان گنڈا سنگھ والا میں آیا کہتے تو صرف اس لئے کہ اللہ داد کے کولہو میں سے نکلتے ہوئے تیل کی پہلی چند بوندیں حاصل کی جا سکیں بسا اوقات ان چند بوندوں کے لئے انہیں بہت زیادہ قیمت دینا پڑتی اور حسینی والا نہر کے ہیڈ میں کام کرنے والے بابو اور اوورسیر جب بہت تھک جاتے تو گنڈا سنگھ والا میں نیکاں کو صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے چلے آتے شاید اس سے ان کی تکان اتر جاتی۔

اس دن جب ہم جو تو کے ہاں سے نکلے تو ماوے کے دیہاتی پیمانے کے مطابق سورج سوا نیزے کے برابر ابھر چکا تھا گنڈا سنگھ والا کے نزدیک نالے پر سفید سفید بگلے پانی میں اٹھتے ہوئے مینڈکوں کو ٹھونگ رہے تھے ان جانوروں میں سنگھاڑوں کے درمیان سورج کے سنہری عکس کے خلاف کہیں کہیں کوئی مرغابی بھی دکھائی دے جاتی۔ جو ایک نامعلوم خطرے سے اپنی ٹانگوں کو یک لخت سمیٹ کر نہایت تیزی سے پر پھڑ پھڑاتی ہوئی

نالے کے اردگرد میلوں تک اُگی ہوئی دُوب میں کہیں غائب ہو جاتی۔
اس دوران ہیں اللہ داد آناد کھائی دیا وہ حسب دستور بڑے اطمینان سے وارث شاہ گا رہا تھا ایک ہاتھ کان پر تھا اور دوسرا ڈنڈے پر جس کی مدد سے وہ آگے بڑھ رہا تھا ڈنڈے کی مدد تو برائے نام تھی اللہ داد گنڈا سنگھ والا اور اس کے نواح کی چپہ چپہ زمین سے واقف تھا یہ بھی نہیں بلکہ اسے اپنے قدموں پر پورا یقین اور بھروسہ تھا وہ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر ہوتا ہوا اپنے جدی کنوئیں کی طرف جا رہا تھا۔
گنڈا سنگھ والا کے شمال کی طرف ایک پانی سے بھرا ہوا چھنب تھا جو مشرق کی طرف سمٹ سمٹا کر ایک نالہ رہ گیا تھا اللہ داد کے کنوئیں خانقاہ والے کو اس نالے پر سے راستہ جاتا تھا ایک بڑے سے شئیشم کو صاف کر کے نالے پر رکھ دیا گیا تھا اس پر سے گزرتے ہوتے لوگ دوسری طرف چلے جاتے ہمارے دیکھتے دیکھتے اللہ داد آیا اس کی لاٹھی پر ایک گانٹھ سی دکھائی دے رہی تھی۔ چند گز کے فاصلے پر سے تو وہ گانٹھ بالکل انسانی آنکھ معلوم ہوتی تھی شاید اسی آنکھ سے دیکھتا ہوا اللہ داد بلا خوف و خطر آگے بڑھ رہا تھا اس کی لاٹھی کی آہٹ پا کر مرغابی تیر کی طرح اڑ کر سنگھاڑوں میں غائب ہو گئی۔ اللہ داد مرغابی اور کونج کے اس طور لپکنے کے انداز سے پوری طرح واقف تھا وہ اب نالے کے کنارے آ چکا تھا شیشم کے ایک تنگ سے راستے پر....

ہمارا سانس رک گیا۔

ایک ــــ دو ــــ چھ ــــ آٹھ۔

اور اللہ داد نالے کے اس طرف تھا آٹھ دس لمبی لمبی ڈگوں میں اس نے اس راستے کو، جس پر سے بینائی والے انسان کو بھی گزرتے ہوئے خوف آتا تھا آنا فاناً پھاند ڈالا تھا۔

ہماری چھٹی میں ابھی کچھ دن باقی تھے جمعرات کو میں اور سنگی بندوق اور ریلی کے کارتوس لے کر ستلج کے کنارے ایک ٹیلے کی اوٹ میں دبکے رہتے آسمان پر شکل مکش کا چاند ستلج کے دبیلع پانیوں میں روشن اور لہروں کا مدوجزر نور و نغمہ کا نیا وہم پیدا کر رہا تھا۔ پانی سے بھیگی ہوئی ہواؤں سے ایک ناگوار سردی پیدا کر دی تھی کبھی کبھی سنگی اپنے بوسیدہ ٹیونک کو بندوق کی مدد سے کانوں تک کھینچ لیتا اور اونگنے لگتا۔

کبھی یوں ہوتا کہ ٹیلے کی اوٹ میں سے ریت کے ذرّوں کی وساطت سے لاکھوں کروڑوں چاند نظر آتے اور آنکھ محسوس کرتی کہ ستلج کے کنارے ہمیشہ کے لئے خوشنما رہے۔ ستلج کے پانی کی ہلکی ہلکی آوازیں صدیوں سے مانوس لے سنائی دیتی اور جی چاہتا کہ کان یہی آواز سنتے رہیں ایسے لمحے زندگی میں بار بار نہیں آتے جب کہ ہم آگ پانی ہوا اور ایسے قدرتی نظاروں سے یوں دوچار ہوتے ہیں کبھی کبھی سنگی کے خراٹے کی آواز فضا کو مکدر کر دیتی

اور میں بندوق کے دستے کو سنگی کے پہلو میں مار کر اسے جگا دیتا یا کبھی یوں ہوتا کہ ستلج کے پار سے چکوے کی آواز آتی اور اس پار سے چکوائی کی جوابی آواز سے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی۔ ہم صبح تک انتظار کرتے رہے لیکن کوئی نیلا ستلج کے کنارے پانی پینے نہ آیا آسمان سے دھند سی اترنا شروع ہو گئی جو سرکنڈوں کے دامن میں بیٹھ گئی اور اس کے اوپر سفیدی میں اودے رنگ کی تہہ سی چھننے لگی اس سے اوپر اودا رنگ نیلاہٹ میں تبدیل ہونا شروع ہوا اور ہمیں صبح کاذب کی روشنی میں دور تک آسمان نظر آنے لگا کچھ دیر کے بعد کسی کرن کے اشارے نے خوبصورت صبح کو شرما دیا۔ شکار کے نہ ملنے سے جو مایوسی ہوئی تھی شفق نے اس کی تلافی کر دی سنگی کے چہرے پر پتلے سرے سے مایوسی کے آثار نظر نہ آتے تھے سنگی کا کیا تھا وہ تو "دوسرے کام" کے لئے آیا تھا۔ ہم نے اپنا خالی تھیلا اٹھایا اب صبح ہو چکی تھی اور وہاں سردی میں بیٹھنا بیکار تھا جوں جوں سورج اوپر آتا گیا مایوسی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ میں نے بندوق اُٹھا کر کھیتوں میں اُترنے والے چند کوؤں پر دو تین فائر کئے لیکن کوّے بھی اُڑ گئے۔

گاؤں پہنچ کر سنگی نے تیل کی پیٹی نکالی اور تیل بیچنا شروع کر دیا گاؤں کی عورتیں شوخ رنگ اور تیز خوشبو کی طرف بہت مائل ہوتی ہیں۔ شہریوں کی طرح تیز رنگ سے ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا نہیں ہوتی اور

نہ تیز خوشبو ان کے سر میں درد اور طبیعت میں متلی پیدا کرتی ہے۔ سنگی مردوں اور عورتوں کے ہجوم میں کھڑا "تیل کا ہے سب کھیل"، اور اس قسم کے پیشہ ورانہ مصرعے پڑھ رہا تھا مرد کھل کر ہنستے تھے اور عورتیں ایک دوسرے کو کہنیاں لگاتی تھیں۔

کچھ دیر کے بعد ایک عورت نے جھولی میں سے کپاس نکال کر سنگی کے سامنے ڈال دی، سنگی نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وہ اس کپاس کا کیا کرےگا۔ اسے نقد پیسے چاہئیں لیکن پھر اس نے کپاس کو قبول کر لیا کپاس گاؤں کے واحد دکاندار کے ہاتھ بک سکتی تھی۔ بلکہ سنگی کو اس سودے میں فائدہ تھا جنس جلدی میسر آتی تھی اور زیادہ ملتی تھی۔

کچھ دیر کے بعد نیکاں بھی اس مجمع میں آئی اس کا جی چاہتا تھا کہ چنبیلی کا خوشبودار تیل خریدے اس نے بڑے شوق سے جہلم آرائیں کے ہاتھ پہ لگے ہوئے تیل کو سونگھا پھر اسے کچھ نفرت سی پیدا ہوئی اور وہ ان لوگوں کے درمیان سے چل دی، اللہ داد بھی اپنی لاٹھی لئے ہوئے ادھر سے گزرا اور بھنبھناتا ہوا ایک طرف کو ہو لیا۔ شام تک آدھی سے زیادہ پیٹی خالی ہو چکی تھی اور سنگی بڑے اطمینان سے بیٹھا جاٹ لوگوں کو مویشیوں کی بیماریوں کے متعلق باتیں بتا رہا تھا۔ جب اسے کسی چیز پہ شک گزرتا تو وہ میری طرف دیکھتا میں اس کی تائید یا تردید کر دیا کرتا "کھرُ آنے"، کی بیماری کے متعلق اس

نے ملبا چوڑا لکچر دیا اور تلقین کی کہ صاف ستھری جگہ مویشی باندھے جائیں تاکہ ان کے پاؤں اس موذی بیماری سے محفوظ رہیں اور تاں اس پر ٹوٹی کہ چنبیلی کا تیل لگانے سے مویشیوں کو یہ بیماری ہو ہی نہیں سکتی۔

اسی شام کو ہمیں پتہ چلا کہ چوپال میں بیٹھ کر اللہ داد سنگی کو اور مجھ کو گالیاں دیتا رہا ہے وہ اپنی لاٹھی گھماتا رہا ہے اور کہتا رہا ہے، چنبیلی کا تیل بالکل نکما ہے بیکار ہے۔ آٹھ دن میں بال سفید کر دیتا ہے۔ اس نے کچی گھانی کے تیل کا بھاؤ پہلے ایک تہائی کم کر دیا اور پھر آدھی قیمت پر بیچنے لگا وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں کا دارسنگی سے باقاعدہ تیل خریدنا شروع کر دے اور اس طرح اس کی تجارت کو نقصان ہو۔

اللہ داد کا تیل خالص تھا اس کے استعمال سے بال برسوں تک سیاہ رہتے تھے لیکن اس سے کھلی کی عجیب سی بدبو آتی تھی لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ جن چیزوں میں کھلی کی بو آتی ہے وہ اس وقت بری ضرور معلوم ہوتی ہیں لیکن آخر کار مفید رہتی ہیں اور جن چیزوں سے چنبیلی کی خوشبو آتی ہے۔ وہ چیزیں اس وقت بھلی لگتی ہیں لیکن بعد میں ان کی قلعی کھل جاتی ہے اور اسے استعمال کرنے والے پر برص کی سفیدی اور سیاہی چھا جاتی ہے لوگ کل کی خبر سننا نہیں چاہتے وہ عموماً آج میں رہتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ تعداد ان انسانوں کی ہے جو آج میں صبح سے لے کر شام کا وقفہ شامل ہے کے لئے صلہ

نہیں ہوتے وہ اسی وقت اور "اب" کے قائل ہوتے ہیں لیکن چونکہ اب بھی آج کی ایک سمٹی ہوئی شکل ہے اس لئے وہ آج کو نہ ماضی میں سمجھتے ہیں نہ مستقبل میں وہ زمان و مکان کی اس قید میں شام تک کا منظر دیکھ لیتے ہیں۔ اور چنبیلی کا یہ "تیل" "آج کا دن" تھا جے لگھانی کے کل کی کوکھ سے پیدا کرتا تھا۔ عورتیں اور مرد گاؤں میں آئے ہوئے ان نئے تاجروں کے قائل ہو گئے تھے۔ دکان دار دیوان نے نہ صرف کئی شیشیاں خرید کر رکھ لیں بلکہ ایک پوری پیٹی کا آرڈر دے دیا اور خوشیا نمبر دار کی مدد سے سنگی نے ایک تانگہ جوتا لیا تاکہ شہر سے باقی تیل بھی لے آتے، اللہ داد یقینی طور پر بیمار آدمی کی طرح سارا دن چوپال سے گھر، گھر سے چوپال، ہٹی سے نمبر دار کے ہاں اور نمبر دار کے ہاں سے دیوانوں کی حویلی تک گھومتا پھرا، خطرے اور ضرورت نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔

"چنبیلی دا تیل لاتے۔۔۔۔ جیل دی ہوا کھاتے" وہ تمام دن یہی گنگناتا پھرتا شعر میں تو زیادہ موزونیت نہ تھی۔ بوجھوں مارنے کی بات تھی لیکن ضرورت کا تقاضہ تھا اس جوابی حملے کے باوجود وہ تمام دن کا انتظار رہا اس کی داڑھی چاروں طرف پھیل گئی اور پہلے کی نسبت زیادہ زرد معلوم ہوتی تھی یوں نظر آتا تھا کہ جنڈ کے اس دیو قامت درخت کے پھول پتوں کو امر بیل نے پوری طرح سے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اس کی مزید نشوونما بالکل رک گئی

ہے سنگی کو ایک اور شرارت سوجھی، یہ بھی اقتضائے وقت تھا۔

"نیکاں کے گھٹنے پہ ایک تل ہے،، سنگی نے جوشو نمبر دار سے کہا۔

"تم نے کیسے جانا،، جوشو نمبر دار نے کہا۔

"بس میں جو کہتا ہوں نیکاں کے گھٹنے پہ ایک تل ہے،، اور اس کے بعد سنگی خاموش رہا سنگی نے جوشو سے کہا جوشو نے دیوان سے کہا، دیوان نے گاؤں کے دوسرے لوگوں سے کہا میں سنگی کی اس مذموم حرکت کو دیکھتا رہا بات پھیل گئی بالکل اس امربیل کی طرح جو ایک دم جسم اور ذہن کا احاطہ کر لیتی ہے سنگی کا تیل بکنے لگا اللہ داد کا پندار ڈگمگا گیا اس رات بہت کہر پڑا اسر شام ہی سے کاٹنے والی سردی کا اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا اس لئے ہم نے ستلج کے کنارے جانے کا خیال چھوڑ دیا سنگی، نحیف جسم کا آدمی ٹیونک سمیت بستر میں گھس گیا تھا اس کے منہ سے روڑی برانڈ (دیسی شراب) کی بو آرہی تھی یہ سب کچھ ایک فتح مندی کا اظہار تھا اس وقت ہسپتال کا ایک ہرکارہ آیا جس نے اطلاع دی کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ دورے پہ آئے ہوتے ہیں، ہمیں ہر حالت میں ہسپتال پہنچنا لازم تھا چنانچہ میں نے سنگی کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا اور زبردستی اسے جوشو کی گھوڑی پہ بٹھا دیا، ابھی ہم گاڑی سے باہر کچھ دور جھنپ کے قریب پہنچے تو ہمیں دیئے کی لو دکھائی دی یہ وہی جگہ تھی جہاں لکڑی کے لٹھے کے ذریعے جھنپ پار کرکے اللہ داد اپنے کھیتوں کو جایا کرتا تھا، اللہ داد

کے ہاتھ میں دیا تھا اسے اپنے تمام بزرگ یاد آ گئے تھے اور وہ ان کی قبر پہ دیا رکھنے کے لئے جا رہا تھا اس دن اس نے کس پھرتی سے وہ راستہ پار کر لیا تھا آج بھی اللہ داد پل پہ پہنچا تو ہمارے سانس رک گئے۔

ایک — دو — چھ —

ایک قدم اور.. پانی کی ایک اچھال آئی اس کے بعد یوں آواز آئی جیسے کوئی گھڑا پانی میں ڈوبتا ہے، دیا جس کی بے بضاعت روشنی میں وہ منظر دکھائی دے رہا تھا پانی میں گم ہو گیا چاند ابھی طلوع نہیں ہوا تھا لیکن رات کے اندھیرے میں ہمیں لاٹھی اور پگڑی پانی کی سطح پہ تیرتی ہوئی نظر آئی اور صبح تک باوجود کوشش کے ہمیں اللہ داد کی لاش نہ مل سکی۔

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اوّل)	قرۃ العین حیدر	پاگل	خلیل جبران
〃 〃 〃 (حصہ دوم)	〃 〃	محبت اور جوانی	〃 〃
آگ کا دریا	〃 〃 〃	ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	〃 〃 〃	پھول کی تنہائی	〃 〃
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری	الٹا درخت	〃 〃
پطرس کے خطوط	〃 〃	محبت کی رات	〃 〃
زیرِ لب	صفیہ اختر	مضامین کرشن چندر	〃 〃
حرفِ آشنا	〃 〃	لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
گنجے فرشتے	منٹو	نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
انارکلی	〃	کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی
ٹھنڈا گوشت	〃	آتشِ گل	
کرنیں	شفیق الرحمٰن	کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
دو ہاتھ	عصمت چغتائی	کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ	تلخیاں	
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی	گلِ نغمہ	فراق گورکھپوری
زرد پتے	خلیل جبران		

مکتبۂ اُردو ادب لاہور